دو باتیں

السلام علیکم!

اس بار سراغ رسانی کے ساتھ ساتھ آپ کو مم جوئی کا لطف بھی آئے گا، گویا ایک ٹکٹ میں دو مزے ملیں گے اور آپ حیران رہ جائیں گے کہ کیس تو کسی کروٹ بیٹھ ہی نہیں رہا، بلکہ شاید یہ بھی پکار اٹھیں، کیس رے کیس تیری کون سی کل سیدھی۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ کے ایسا پکار اٹھنے پر کوئی اونٹ آپ سے ناراض ہو جائے۔ خیر کوئی بات نہیں، اونٹ کو منانا ذرا بھی مشکل نہیں، بہت سیدھا جانور ہے۔ الٹا جانور تو بس انسان ہی ہے۔ کل تو دراصل اس کی کوئی سیدھی نہیں، اونٹ بے چارے کا تو مفت میں نام بدنام ہے۔ ایسی ایسی عجیب و غریب باتیں حضرت انسان سے متعلق سننے میں آتی ہیں کہ خدا کی پناہ، لیکن یہ کیا، بات تو دو باتیں کی تھی، ناول کا ذکر تھا، میں کیا لے بیٹھا۔ اوہ میں سمجھ گیا، دراصل میں بھی اونٹ نہیں، انسان ہوں اور میری بھی ہر کل بالکل ٹیڑھی ہے۔ اسی لیے تو ٹیڑھے میڑھے پلاٹوں والے ناول آپ کی خدمت میں پیش کرتا رہتا ہوں اور حیران ہوتا رہتا ہوں اس بات پر کہ آپ کو یہ پسند کس طرح آ جاتے ہیں، پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ ان میں دراصل پسند آنے والی تو کوئی بات نہیں ہوتی، بس میرا دل رکھنے کے لیے آپ لوگ پسند کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں آپ کا شکریہ بھی تو ادا نہیں کرتا، انسان جو ہوا۔ خیر یہ باتیں تھیں بے کل کی دو باتیں۔ آپ ان کا نام اونٹ اور انسان بھی رکھ سکتے ہیں اور یہ کسی ناول کا نام بھی ہو سکتا ہے۔

اشتیاق احمد

یہ کیا؟

فون کی گھنٹی بجی۔ اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انسپکٹر جمشید کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے محسوس کیا، آنکھ بہت گہری نیند سے کھلی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے ریسیور اٹھایا اور لیٹے ہی لیٹے کان سے لگاتے ہوئے بولے:

''ہیلو، انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ فرمایئے، آپ کون ہیں اور اتنی رات گئے فون کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

''مم، میں۔ جج، جلدی۔ آیئے۔'' دوسری طرف سے ایک بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''جلدی آؤں، لیکن کہاں۔ آپ کون ہیں، کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''مم، میں عرفان عازی ہوں۔ ۱۱۲۶ شاہی سٹریٹ سے بول رہا ہوں'' یہ نیاز روڈ پر ہے۔'' وہ پھر کہتے کہتے رک گیا۔

''چلیے، یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہے ہیں۔ اب یہ بھی بتا دیجیے کہ مجھے کس خوشی میں بلا رہے ہیں؟'' انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

''مم، میرے۔ میرے سامنے والے مکان سے کچھ خوف ناک قسم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لل، لیجیے، ایک اور بھیانک آواز سنائی دی ہے۔'' اس نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا، ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے کسی کا نرخرہ کٹ گیا ہو، لیکن آواز

بہت مدھم تھی، تاہم انسپکٹر جمشید کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ انہوں نے جلدی سے کہا:

"آپ نے پولیس اسٹیشن کو فون کیوں نہیں کیا؟"

"کیا تھا، کسی نے ریسیور اٹھایا ہی نہیں۔ اچانک مجھے آپ کا خیال آیا۔ آپ کے نمبر بھی ڈائریکٹری میں جلدی ہی مل گئے، بس میں نے آپ کے نمبر گھما ڈالے۔" اس نے روانی کے عالم میں کہا۔

"اچھی بات ہے، میں آرہا ہوں۔ آپ اپنے گھر کے دروازے پر مجھے ملیے گا۔ سامنے والے مکان کے کسی معاملے میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں، بس دیکھتے رہیے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو پونے تین بج رہے تھے۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور پھر بیگم کو شانے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولے:

"ہیلو بیگم، میں ایک ضروری کام سے نیاز روڈ تک جا رہا ہوں۔"

"جی۔ جی اچھا۔" انہوں نے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

گرمی کے دن تھے۔ آج بہت دنوں بعد ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نصیب ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے سب لوگ گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کے کمروں کے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے اندر جھانکا، تینوں نیند میں غرق نظر آئے۔ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ فرزانہ کی آواز پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

"مجھے نہیں لے جائیے گا کیا؟"

"ارے فرزانہ، تم جاگ رہی ہو۔" وہ ٹھٹک کر رک گئے۔

"جی ہاں، مسلسل بجنے والی فون کی گھنٹی نے مجھے بھی جگا دیا تھا۔" وہ

مسکرائی۔

"اچھا تو پھر تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ، وقت بہت کم ہے۔"

"تیار تو میں پہلے ہی ہو چکی ہوں۔" اس نے شوخ انداز میں کہا۔

"بہت خوب، یہ ہوئی نا بات۔"

دونوں نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ محمود کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

"ابا جان، یہ ٹھیک ہے کہ فرزانہ کے کان بہت تیز ہیں اور مسلسل بجنے والی فون کی گھنٹی نے اسے جگا دیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اور فاروق بہرے ہیں اور ہمیں فون کی گھنٹی نہیں جگا سکتی۔"

"اوہو، تو تم بھی جاگ رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"نہ صرف جاگ چکے ہیں، بلکہ لباس بھی تبدیل کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ جوتے بھی پہن چکے ہیں، یہ دیکھیے۔" فاروق نے یہ کہتے ہوئے اپنے پیروں سے چادر الٹ دی۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے بغیر نہ رہ سکے اور بولے:

"اس کا مطلب ہے۔ جاگنے کے معاملے میں تمہاری امی پیچھے رہ گئیں۔"

"یہ غلط ہے۔" پیچھے سے بیگم جمشید کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑے تو بیگم جمشید دروازے میں کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"میں تو پہلی گھنٹی کی آواز سن کر ہی جاگ گئی تھی، لیکن جان بوجھ کر سوتی بن گئی۔"

"لیکن کیوں؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"میں چاہتی تھی، فون کرنے والا جان جائے کہ سونے کا وقت ہے اور اسے دوسروں کی نیند خراب کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، لیکن اس نے فون کا سلسلہ بند نہ

کیا، یہاں تک کہ آپ جاگ گئے۔"

"اوہ نہیں بیگم، قوم کے ہر فرد کو حق ہے، جب بھی اسے قانون کے محافظوں کی ضرورت پیش آئے، وہ ہمیں جگائے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ تم دروازہ اندر سے بند کرلو اور آواز پہچانے بغیر کسی کے لیے دروازہ نہ کھولنا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فون کسی کی چال ہو۔" انہوں نے کہا اور قدم اٹھا دیے۔

"اوہ۔" بیگم جمشید خوف زدہ انداز میں بولیں۔

"خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے صرف خیال ظاہر کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ بات ہو بھی یہی۔"

وہ جیپ میں بیٹھے اور نیاز روڈ پر پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ جب وہ شاہی سٹریٹ میں ۱۱۲۶ کے سامنے پہنچے، دروازے میں ایک لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر صاف ستھرا لباس تھا۔

"آپ عرفان غازی ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ج، جی ہاں۔ اور آپ شاید انسپکٹر جمشید ہیں۔"

"شاید نہیں، یقیناً۔" فاروق بڑبڑایا۔

"بس، سامنے والا مکان ہے، جس میں سے آوازیں سنائی دی ہیں۔"

"فون کے بعد بھی آپ نے کچھ آوازیں سنیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں، اس کے بعد سے اب تک تو بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔"

"آوازیں کس قسم کی تھیں؟"

"لڑنے اور جھگڑنے کی آوازیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو آدمی ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تل گئے ہوں اور آخری آواز تو بہت ہی بھیانک تھی، جیسے کسی کا گلا کاٹا جا رہا ہو۔"

"اوہ، تو کیا آپ کی آنکھ ان آوازوں کو سن کر کھلی تھی؟" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

"جی نہیں، میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔"

"اتنی رات گئے آپ کیوں جاگ رہے تھے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"جی، بات دراصل یہ ہے کہ میں اس مکان میں کرائے دار ہوں۔ ابھی چھ ماہ پہلے ہی کرائے پر لیا ہے۔ مکان میں ہر طرف جالے لگے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی روز سے جالے صاف کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فرصت ہی نہیں ملتی تھی، آخر آج رات جاگ کر جالے صاف کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت میں اپنے کمرے کے جالے صاف کر رہا تھا کہ سامنے والے مکان میں لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے۔" انسپکٹر جمشید نے لمبا سانس کھینچا۔

"جی ہاں، بالکل یہی بات ہے۔"

"کیا آپ کے کمرے میں کوئی کھڑکی اس مکان کے سامنے کھلتی ہے؟"

"جی ہاں، دوسری منزل پر میرے کمرے کی کھڑکی اس مکان کی دوسری منزل والے کمرے کی کھڑکی کے بالکل سامنے ہے۔ اسی کھڑکی میں سے میں نے ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"ت، تو آپ نے قتل کا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟" فرزانہ کانپ اٹھی۔

"جی ہاں، میں یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ مجھے عدالتوں میں جاتے ہوئے بہت ڈر لگتا ہے، لیکن اب آپ نے پوچھا تو بتانا پڑا۔"

"آئیے، پہلے آپ کے کمرے سے اس کمرے کا جائزہ لے لیں۔ اس

کے بعد اس کے دروازے پر دستک دیں گے۔ بظاہر تو یوں لگتا ہے جیسے اس مکان میں کچھ بھی نہیں ہوا ہے، کیونکہ اگر لڑائی جھگڑا ہوا ہوتا تو گھر کے سب افراد جاگ رہے ہوتے۔''

''جی نہیں، یہ ضروری نہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب، کیا ضروری نہیں؟'' فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ کہ سب لوگ جاگ رہے ہوتے۔ اوپر والی منزل پر صرف ایک ہی کمرہ ہے، باقی لوگ نچلی منزل میں رہتے ہیں۔ بھورانی صاحب اوپر سوتے ہیں۔ اس لیے نیچے سونے والوں کو تو پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔''

''خیر دیکھتے ہیں، آیئے۔''

وہ اوپر پہنچے، اس مکان میں بھی اوپر صرف ایک کمرہ تھا۔ شاید پوری گلی کے مکان ایک طرز کے بنے ہوئے تھے۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ کھلے ہوئے تھے۔ ایک دیوار سے لکڑی کی چھوٹی سی سیڑھی لگی ہوئی تھی اور پاس ہی ایک بانس فرش پر پڑا تھا۔ اس کے ایک سرے پر جالے اتارنے والا برش لگا ہوا تھا۔ انہوں نے کھڑکی میں سے دوسرے مکان کے کمرے میں دیکھا، فرش پر کوئی شخص مڑا تڑا سا پڑا تھا۔ زیرو کے بلب کی روشنی میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ اگرچہ گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی اور دونوں مکانوں کا درمیانی فاصلہ پندرہ فٹ کے قریب رہا ہوگا۔

''آؤ بھئی، جلدی کرو، یہ تو واقعی قتل کا معاملہ جان پڑتا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے پریشانی کے عالم میں کہا اور زینے کی طرف مڑ گئے۔ اب وہ پھر گلی میں آئے۔ انسپکٹر جمشید نے سامنے والے مکان کے دروازے پر دستک دی۔

پہلی دستک کو جب پورا ایک منٹ گزر گیا تو انہوں نے پھر گھنٹی بجائی اور دباؤ ڈالے چلے گئے۔ آخر نچلی منزل کے ایک کمرے میں روشنی ہوئی، پھر کوئی باہر نکلا

اور قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور آنکھوں میں گہری نیند لیے درمیانے قد کا ایک صحت مند آدمی نظر آیا۔

''میں شاکر حمید ہوں۔ فرمایئے، کیا بات ہے۔ اتنی رات گئے آپ لوگوں کی نیند کیوں حرام کرتے پھر رہے ہیں؟''

''آپ سے پہلے ہماری نیند حرام کی گئی ہے، اس لیے ہم نے سوچا، ہم بھی ایک دو آدمیوں کی نیند تو حرام کر ہی دیں۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر کہا۔

اسی وقت اس کی نظر عرفان غازی پر پڑی۔ وہ چونک کر بولا:

''ارے، غازی صاحب۔ آپ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہیں۔ خیر تو ہے؟''

''کیا دروازہ اندر سے بند تھا؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''رات کے وقت بھلا دروازہ اندر سے بند کیوں نہیں ہوگا۔'' اس نے بھنا کر کہا، پھر عرفان غازی سے بولا:

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو میں نے ہی بلایا ہے۔ میں نے آپ کے گھر کی اوپر والی منزل میں گڑبڑ کی آوازیں سنی تھیں۔ میں آپ کا نیا پڑوسی ہوں۔ میرا یہ حق بنتا تھا کہ آپ لوگوں کو پریشانی سے نجات دلانے کی کوشش کروں۔''

''اوپر والی منزل۔ وہ کمرہ تو ہمارے کرائے دار کا ہے۔'' اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

''آیئے دیکھیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

سب لوگ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ آخر اوپری منزل کے

کمرے میں داخل ہوئے۔ زیرو کے بلب کی روشنی میں ہی انہوں نے صاف طور پر دیکھ لیا کہ ایک شخص کمرے کے فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کے ارد گرد خون پھیل گیا تھا۔ اسکے کپڑے بھی خون میں لت پت تھے، گویا وہ اپنے خون میں نہایا ہوا تھا۔ دہشت سے ان کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر اس کے سر کے بالوں کو پکڑا اور سر اوپر اٹھایا۔ شاکر حمید کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ چاقو لاش کے نیچے دبا نظر آیا۔

''محمود، پولیس کو فون کر دو۔'' انسپکٹر جمشید افسوس زدہ لہجے میں بولے۔

''جی بہتر۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل کر زینے کی طرف چلا گیا، کیونکہ شاکر حمید کے ہاں فون نہیں تھا۔

''فاروق، فرزانہ، پورے گھر کا جائزہ لے لو۔ دروازوں اور کھڑکیوں کو دیکھ لو، کیا سب اندر سے بند ہیں۔''

''جی اچھا۔'' انہوں نے ایک ساتھ کہا اور وہ بھی چلے گئے۔

''تو یہ آپ کے کرائے دار تھے؟''

''جی ہاں، میں اس مکان کا مالک ہوں۔ ایک دفتر میں کلرک ہوں۔ گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔ اس لیے اوپر والا کمرہ کرائے پر دے رکھا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''ان کا نام کیا تھا؟''

''اکبر بھورانی۔'' اس نے کہا۔

''اکبر بھورانی، عجیب سا نام ہے۔ خیر، یہ کب سے کرائے دار تھے یہاں؟''

''تقریباً ایک سال سے۔''

''یہ کرتے کیا تھے؟''

''معلوم نہیں، میں نے دو ایک بار پوچھا تو یہی جواب دیا کہ میں ایک ادارے کا کمیشن ایجنٹ ہوں۔''

''ادارے کا نام نہیں بتایا؟''

''جی نہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ اب ہمیں ان کے سامان کی تلاشی لینا ہوگی۔ اسی طرح ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟'' انہوں نے کہا۔

''جی بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

اسی وقت محمود اندر داخل ہوا۔

''فون کر دیا ہے۔ پولیس چند منٹ تک پہنچ جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، تم بھی فاروق اور فرزانہ کی مدد کرو۔''

''ہم آ گئے ہیں ابا جان، گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند ملے ہیں۔ نچلی منزل کی کھڑکیوں میں تو یوں بھی سلاخیں لگی ہیں، بس اسی کمرے کی کھڑکی میں سلاخیں نہیں ہیں۔ لیکن یہ دوسری منزل پر ہے اور کافی اونچائی پر ہے۔'' فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

''اوہو، یہ تو شاکر صاحب اور ان کے گھر والوں کے لیے بہت خطرناک بات ہو گئی۔'' انہوں نے چونک کر کہا۔

''جی کیا مطلب؟'' شاکر حمید نے گھبرا کر کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل باہر سے نہیں آیا تھا۔ گھر کے ہی کسی فرد نے ہی قتل کیا ہے۔''

''نہیں۔'' شاکر حمید خوف زدہ آواز میں چلایا۔ اس وقت انسپکٹر جمشید اکبر

بھورانی کی چیزوں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ اچانک ان کے منہ سے نکلا:

"ارے، یہ کیا؟"

☆☆☆

چار خط

انہوں نے دیکھا، ان کے ہاتھ میں چند خطوط تھے۔ ان خطوط پر اکبر بھورانی کا نام لکھا تھا اور نیچے اس مکان کا پتا، محکمہ ڈاک کی مہریں بھی لگی ہوئی تھیں۔

"ابا جان، آپ چونکے کیوں، یہ تو صرف چار خط ہیں۔ ابھی آپ نے ان کی تحریر بھی نہیں پڑھی۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، لو تم بھی ان لفافوں کو دیکھ لو، میرے چونکنے کی وجہ سمجھ میں آجائے گی۔" انہوں نے لفافے ان کی طرف بڑھا دیے۔

تینوں نے ان چاروں لفافوں کو دیکھا۔ ایک لفافے پر لکھا نظر آیا، تیسری دھمکی۔ ایک پر دوسری دھمکی۔ تیسرے خط پر پہلی دھمکی اور ایک پر چوتھی دھمکی لکھا تھا۔

انہوں نے پہلی دھمکی والے خط کو کھولا۔ اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکلا۔ اس پر ہاتھ سے لکھی یہ تحریر نظر آئی:

"بھورانی،

میں بھی یہاں پہنچ گیا ہوں۔ اب تم میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے۔ اب بھی وقت ہے۔ مجھ سے معاملہ طے کرلو۔ اگر معاملہ طے کرنے پر خود کو تیار پاؤ تو اپنے گھر کے دروازے پر

چاک سے ضرب کا نشان بنا دینا، میں تمہیں ملاقات کا وقت
بتا دوں گا اور جگہ بھی طے ہو جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ میری
پہلی دھمکی ہے۔ اصول کے مطابق تمہیں ایسی صرف چار
دھمکیاں ملیں گی۔ چوتھی دھمکی پر بھی اگر تم نے معاملہ کی بات
نہ کی تو میں موت بن کر تمہارے سر پر پہنچ جاؤں گا۔ تمہارا
بدترین دشمن:

جملات"

انہوں نے بے تابی کے عالم میں دوسرا خط کھولا۔ اس پر لکھا نظر آیا:

بھورانی،

تم نے ضرب کا نشان نہیں لگایا۔ آج تم تمام دن گھر سے باہر
بھی نہیں نکلے، لیکن اس طرح کب تک محفوظ رہو گے۔
میں کسی نہ کسی طرح اس گھر میں داخل ہو جاؤں گا۔ یہ میری
دوسری دھمکی ہے۔ اب بھی وقت ہے، ضرب کا نشان لگا دو۔
اور معاملہ طے کر لو، ورنہ میری تیسری اور چوتھی دھمکی کے منتظر
رہو۔

جملات"

تیسرے خط کے الفاظ یہ تھے:

"بھورانی،

تیسری دھمکی پڑھ رہے ہو۔ ہوش کے ناخن لو۔ مجھے اچھی
طرح جانتے ہو، پھر بھی لاپروائی سے کام لے رہے ہو۔ کیا تم
یہ سمجھتے ہو کہ میں اس مکان میں داخل نہیں ہو سکوں گا، یہ

تمہاری بھول ہے۔ میں معاہدے کی وجہ سے مجبور ہوں، ورنہ
کب کا تم تک پہنچ گیا ہوتا۔ ابھی آخری دھمکی باقی ہے۔ میں
آج پھر ضرب کا نشان تمہارے کرائے کے گھر کے دروازے
پر دیکھوں گا۔

جملات"

چوتھے خط کے الفاظ سنسنی خیز تھے:

بھورانی،

یہ آخری دھمکی ہے۔ آج رات تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔
تمہاری موت کے ساتھ ہی یہ راز ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے
گا اور میں اس طرح بھی فائدے میں رہوں گا، نقصان میں
صرف تم رہو گے، کیونکہ جان سے جاؤ گے۔ ہوشیار رہنا
بھورانی، میں آج رات تم تک ضرور پہنچوں گا۔

جملات"

چاروں خط پڑھنے کے بعد وہ شاکر حمید کی طرف مڑے:
"کیا مسٹر بھورانی چند دنوں سے کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے؟"
"جی ہاں، ہم نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا
کہ طبیعت خراب ہے۔ ان دنوں ان کا کھانا بھی میں ہی لا کر دیتا رہا ہوں۔"
"اور وہ خوف زدہ بھی نظر آتے رہے ہوں گے۔"
"جی ہاں، میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا۔"
"آپ کے گھر کے کل کتنے افراد ہیں؟"
"میں، میری بیوی اور دو چھوٹے بچے، تین اور چار سال کے۔" اس نے

بتایا۔

"کیا مسٹر بھورانی کو آپ نے قتل کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

"جی، یہ آپ کیا کہہ ر   ہیں۔ بھلا مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"مسٹر بھورانی کے سامان سے نظر آتا ہے، وہ بہت مال دار آدمی تھے کیا خبر وہ اپنے پاس بہت سی نقدی بھی رکھتے ہوں اور آپ نے اس نقدی کی لالچ میں انہیں قتل کر دیا ہو۔"

"اف خدا، یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" شاکر حیرت سے کانپ کر کہا۔

"اگر آپ نے اسے قتل نہیں کیا، تو پھر آپ ہی بتایئے، قاتل اندر کس طرح داخل ہوا، جب کہ دروازے اندر سے بند تھے اور آپ کے جاگنے پر بھی بند ہی ملے ہیں۔" محمود نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"قاتل اس کھڑکی کے سوا اور کس طرح اندر داخل ہو سکتا تھا۔ دیکھ رہے ہیں، اس کھڑکی میں سلاخیں نہیں ہیں۔"

"ہوں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف بڑھے، جھک کر دیکھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولے:

"رات کے وقت ایک لمبی سیڑھی کے ذریعے اس کمرے میں داخل ہو جانا کوئی مشکل کام نہیں، لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا قاتل سیڑھی اپنے گھر سے لے کر آیا تھا اور پھر اٹھا کر واپس بھی لے گیا۔ ایک آدمی کا اتنی لمبی سیڑھی کا لے کر آنا اور پھر واپس بھی لے جانا عجیب سی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"لیکن ابا جان، یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ سیڑھی کسی گاڑی پر رکھ کر لایا ہو،

جس طرح بجلی یا فائر بریگیڈ والے سیڑھیاں اٹھائے پھرتے ہیں۔" محمود بول اٹھا۔

"ہوں، اس کا امکان ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر کھڑکی کی طرف بڑھے، جھک کر دیکھا، پھر سامنے دیکھا۔ عرفان غازی اپنی کھڑکی میں کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں ان کی نظر اس سیڑھی پر پڑی۔ جو عرفان غازی کے کمرے میں رکھی تھی۔ ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا:

"اوہو، وہاں بھی تو ایک سیڑھی موجود ہے۔"

☆☆

"جی کیا مطلب، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عرفان غازی اس سیڑھی کے ذریعے کمرے میں داخل ہوئے اور اکبر بھورانی کو قتل کر کے اسی سیڑھی کے ذریعے نیچے اتر گئے۔" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

"میں یہ نہیں کہتا، لیکن اس سیڑھی کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ اس سے پہلے ہم اس کھڑکی سے فرش تک کی لمبائی دیکھیں گے۔ مسٹر شاکر کوئی رسی یا دھاگا مہیا کر سکتے ہیں۔"

"جی کیوں نہیں؟" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ جلد ہی وہ نائیلون کی ایک رسی لیے اندر داخل ہوا۔ انسپکٹر جمشید نے رسی نیچے لٹکائی اور جب اس کا سرا زمین کو چھونے لگا تو رسی میں اس جگہ گرہ لگا دی، پھر اسے کھینچ لیا اور بولے:

"آؤ بھئی، ذرا عرفان غازی کی سیڑھی کی پیمائش کر لیں۔"

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور چند پولیس افسر اور دوسرے ماہرین اندر داخل ہوئے۔ ان کی نظریں جوان پر پڑی تو چونک اٹھے:

"اوہو، یہاں تو آپ لوگ بھی موجود ہیں، پھر بھلا ہماری کیا ضرورت تھی۔" پولیس انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ شاید وہ ان سے حسد کرتا تھا۔

''آپ کے علاقے کا کیس ہے، ہم تو بس یونہی چلے آئے۔ دراصل قتل کے عینی شاہد نے پہلے آپ ہی کو فون کیا تھا، لیکن کسی نے فون کا ریسیور نہ اٹھایا تو انہوں نے مجھے فون کر دیا۔''

''پولیس اسٹیشن کا فون کل سے خراب ہے اور آپ نے کیا فرمایا، قتل کا کوئی عینی شاہد بھی موجود ہے، بھئی واہ، پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، بلکہ مسئلہ تو اور الجھ گیا ہے۔ انہوں نے قاتل کی شکل صورت نہیں دیکھی، کیونکہ زیرو کے بلب کی روشنی میں انہیں دو سائے سے لڑتے ہوئے دکھائی دیے تھے، لہٰذا وہ نہیں بتا سکتے، قاتل کون تھا۔''

''اوہ۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے مایوسانہ لہجے میں نکلا۔

''آپ اپنی کارروائی مکمل کرائیے، ہم ذرا شاکر حمید صاحب کے پڑوسی محلے سے مل کر آتے ہیں۔''

''تو کیا مقتول کا نام شاکر حمید تھا؟''

''جی نہیں۔ شاکر حمید اس مکان کے مالک ہیں۔ مقتول اس مکان میں کرائے دار تھا۔ اس کا نام اکبر بھورانی تھا۔''

''کیا؟'' انسپکٹر خوف اور حیرت کی زیادتی سے چلا اٹھا۔

اور وہ بوکھلا کر اسے دیکھنے لگے۔ انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے:

''خیر تو ہے، آپ اکبر بھورانی کا نام سن کر چلائے کیوں۔ اور خوف کیوں محسوس کر رہے ہیں، جب کہ یہ مر بھی چکا ہے۔''

''م، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اکبر بھورانی مر چکا ہے۔ میں ایک سرحدی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ بیس سال پہلے اپنا علاقہ چھوڑ کر ادھر آ گیا تھا۔ اس وقت کے بعد آج اکبر بھورانی کا نام سنا ہے۔ ہمارے علاقے کا نام پرانا بھوران ہے، اب

وہ قصبہ جالوم کہلاتا ہے۔''

''اوہو، اچھا۔'' ان کی دلچسپی اچانک بڑھ گئی۔

''ہاں، اکبر بھورانی اس علاقے کا پراسرار ترین آدمی تھا۔ سب کے لیے ایک سوالیہ نشان تھا۔ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے۔ بس وہ لوگوں کو عجیب و غریب خط لکھتا رہتا تھا۔ اس کے خطوط نے پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ کبھی کسی دولت مند کو اس کا خط ملتا کہ فلاں آدمی کو اتنے ہزار روپے دے دو۔ کبھی کسی سرکاری افسر کو خط ملتا کہ فلاں آدمی کو فلاں ملازمت دے دو۔ جن لوگوں کو ایسے خط ملتے، اگر وہ ان میں لکھی ہدایت پر عمل نہ کرتے تو ان پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہوتی۔ یا تو وہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتے یا ان کے گھر میں آگ لگ جاتی۔ خطوط میں وہ لکھ بھی دیا کرتا تھا کہ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو حادثے کا شکار ہو جاؤ گے یا تمہارے مکان کو آگ لگ جائے گی۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے یہی خیال کیا کہ اکبر بھورانی نامی آدمی ضرور کوئی پاگل ہے یا پھر اس کے دماغ میں جاسوسی کے جراثیم بھر گئے ہیں، لیکن جب کئی ایسے لوگ جنہیں اس کے خط ملے تھے، حادثات کا شکار ہو کر مر گئے اور کئی ایک کے مکانات کو آگ لگ گئی تو لوگ اکبر بھورانی سے خوف کھانے لگے، اس کا خط ملنے سے لرزنے لگے اور اس طرح پورے علاقے کے لوگوں کے لیے اکبر بھورانی ایک سوال بن گیا۔ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا ہے، کہاں رہتا ہے، وہ لوگوں کو حادثات کا شکار کس طرح بنا دیتا ہے یا ان کے مکانات کو آگ کس طرح لگا دیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں پر اس کا خوف بُری طرح سوار ہوتا چلا گیا۔ پولیس نے اس کا کھوج لگانے کی سر توڑ کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ انہی دنوں میں ادھر آ گیا اور پھر اکبر بھورانی کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔ ملازمت کی مصروفیات

نے کچھ اس طرح گھبرا کر کسی دوست کے ذریعے بھی اس کے بارے میں معلوم نہ کرسکا اور آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد میں نہ صرف اس کا نام سن رہا ہوں، بلکہ آنکھوں کے سامنے اس کی لاش پڑی ہے۔'' پولیس انسپکٹر یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا۔ کمرے میں موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ آخر اس سناٹے کو فاروق کی آواز نے توڑا۔

''تب پھر آپ اب اپنے علاقے سے معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آپ کے آنے کے بعد اکبر بھورائی پر کیا گزری۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکا یا نہیں۔''

''ہاں، میں ایسا ضرور کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''معاملہ اب اور بھی دلچسپ ہوگیا۔ لاش کے نیچے آلۂ قتل بھی موجود ہے۔ ہوسکتا ہے، اس پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید کمرے سے نکل گئے۔ تینوں نے ان کا ساتھ دیا۔ نیچے اتر کر انہوں نے عرفان غازی کے دروازے پر دستک دی۔ عرفان غازی نے کھڑکی میں سے سر نکال کر نیچے جھانکا اور انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

''خیر تو ہے جناب؟''

''دروازہ کھولیے، آپ سے چند سوال کریں گے۔''

''جی اچھا۔'' اس نے کہا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جلد ہی دروازہ کھلا۔ انہوں نے قدم اٹھائے۔ اسی وقت فرزانہ کا پاؤں پھسل گیا، وہ گرتے گرتے بچی، اس کا ہاتھ سڑک سے چھو گیا اور اس کے سہارے ہی وہ سیدھی ہونے میں کامیاب ہوئی۔

''خیر تو ہے، کس خوشی میں پھسلی ہو۔'' فاروق نے حیران ہوکر کہا۔

''عجیب ہو تم، بھلا پھسلا بھی کسی خوشی میں جاتا ہے۔'' محمود نے بھنا کر کہا۔

''کم از کم فرزانہ سے اس کی امید کی جاسکتی ہے۔'' فاروق نے مسکرا کر کہا۔

''بات تو فاروق نے ٹھیک کہی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔ ان کی بات بھی ٹھیک تھی، کیونکہ فرزانہ جب بھی اس طرح گرتی تھی، اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی تھی۔

''یہ بات نہیں، میں واقعی پھسل گئی تھی۔ یہ دیکھیے، نیچے ایک غبارہ پڑا ہے۔ اس پر سے پاؤں پھسل گیا۔ یہاں جگہ بھی گیلی ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔

''اوہ، چلو خیر کوئی بات نہیں۔ چوٹ تو نہیں آئی نا؟''

''جی نہیں، خدا کا شکر ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ عرفان غازی کے پیچھے اندر داخل ہوئے اور پھر اوپری منزل پر آئے۔

''لو بھئی محمود، اس کا سرا پکڑ کر سیڑھی پر چڑھ جاؤ۔''

''جی کیا مطلب، آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' عرفان غازی بوکھلا کر بولا۔

''پیمائش۔'' فاروق بولا۔

''پیمائش، کس چیز کی؟'' عرفان غازی کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

''اس سیڑھی کی۔ کیا خبر آپ یہ سیڑھی کھڑکی کے نیچے رکھ کر اندر داخل ہوگئے ہوں۔''

''بھلا مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی یہ سیڑھی اتنی بڑی نہیں ہے۔''

"ہم پھر بھی اس کی پیمائش کریں گے۔"

"شوق سے کیجیے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

محمود رسی کا سرا پکڑ کر سیڑھی کے آخری ڈنڈے تک پہنچ گیا۔ اس نے رسی کا سرا اس کے بانس کے سرے پر لگا دیا۔ انسپکٹر جمشید نے رسی فرش سے لگا دی، لیکن کافی لمبی رسی بچ رہی جس کا مطلب یہ تھا کہ سیڑھی بہت چھوٹی ہے اور کھڑکی تک نہیں پہنچ سکتی۔

"نہیں بھئی، نیچے اتر آؤ۔ قاتل اس سیڑھی کے ذریعے اکبر بھورانی کے کمرے میں داخل نہیں ہوا۔"

"جی بہتر، میرا تو پہلے ہی یہ خیال تھا۔" محمود نے کہا اور نیچے اتر آیا۔

"حیرت ہے، آپ تو مجھے ہی قاتل بنانے پر تل گئے ہو، حالانکہ اس واردات کی اطلاع دینے والا میں ہی ہوں۔"

"سیڑھی دیکھ کر خیال آ گیا تھا، کیونکہ اس کیس میں قاتل سیڑھی کے بغیر کمرے میں داخل۔ ارے......" انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک لہرائی، پھر جلدی سے بولے:

"محمود، جلدی سے اکبر بھورانی کے کمرے میں جاؤ۔"

"جی، لیکن جا کر کروں گا کیا؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"پہلے وہاں پہنچ تو لو، یہ بات تو بعد میں بتائی جائے گی۔" فاروق نے منہ بنایا اور محمود اسے گھورتا ہوا چلا گیا۔ جلد ہی اس نے سامنے والے کمرے سے کہا۔

"میں یہاں پہنچ گیا ہوں ابا جان، فرمایئے، کیا حکم ہے؟"

"یہ لو، میں رسی کا سرا تمہاری طرف اچھالتا ہوں، اسے پکڑ کر کھڑکی کے

ساتھ لگا دو۔ میں دونوں کھڑکیوں کا درمیانی فاصلہ ناپنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ اکبر بھورانی کے کمرے میں موجود پولیس والے اور دوسرا عملہ بھی حیران ہو کر اس عمل کو دیکھنے لگا۔ انسپکٹر جمشید نے رسی عرفان غازی کی کھڑکی سے لگا دی، پھر بولے:

"بس محمود، رسی چھوڑ دو اور ادھر آ جاؤ۔" یہ کہہ کر رسی کھینچ لی اور فاروق کو اس کا سرا دیتے ہوئے بولے:

"سیڑھی کے اوپر والے سرے سے اس کا سرا لگا دو۔"

فاروق اوپر چڑھ گیا اور حکم کی تعمیل کی۔ انسپکٹر جمشید نے رسی اس جگہ سے پکڑ رکھی تھی، جس جگہ پر وہ کھڑکی سے لگی تھی۔ دوسرا انہوں نے سیڑھی کے نچلے حصے پر لگایا، لیکن رسی چند انچ بڑھ گئی۔

اسی وقت محمود اوپر پہنچ گیا۔

"نہیں بھئی، یہ سیڑھی دونوں کھڑکیوں کے درمیانی فاصلے سے بھی کم لمبی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا، شاید اس سیڑھی کو دونوں کھڑکیوں پر رکھ کر عرفان غازی اکبر بھورانی کے کمرے میں پہنچے ہیں۔"

"اف خدا، کیا آپ کو اس بھری دنیا میں بس میں ہی ایک قاتل نظر آ رہا ہوں، جو گھما پھرا کر مجھے ہی قاتل ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یہ بات نہیں غازی صاحب، بس اس سیڑھی کی وجہ سے یہ خیالات آ گئے تھے۔ آپ محسوس نہ کریں۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ کم از کم اکبر بھورانی کے قاتل آپ نہیں ہیں۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔"

"شکریہ، آپ کے یہ الفاظ سن کر میری جان میں جان آئی ہے۔" اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"وہ نیچے اترنے لگے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید بولے:

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کیس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں اکبر بھورانی کے علاقے میں جانا پڑے گا۔ اس کیس کا سلسلہ وہاں تک چلا گیا ہے۔"

"آپ کا مطلب، انسپکٹر صاحب کے سرحدی قصبے سے ہے؟" محمود بولا۔

"ہاں، ہم صبح وہاں کے لیے روانہ ہوں گے۔" انہوں نے کہا اور تینوں حیران رہ گئے۔ وہ تو اس قتل کو گھریلو قسم کا قتل خیال کر رہے تھے، لیکن اس کا سلسلہ تو کسی دور دراز علاقے تک چلا گیا تھا۔ کمرہ واردات میں پولیس اپنا کام تقریباً مکمل کر چکی تھی، چنانچہ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"کیوں جناب، آلۂ قتل پر انگلیوں کے نشانات ملے ہیں یا نہیں؟"

"جی نہیں، کسی بھی چیز پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے۔ اس نے ضرور دستانے پہن رکھے تھے۔" ایک ماہر نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ کیا کہتے ہیں، یہ قتل کس وقت کیا گیا؟"

"دو اور اڑھائی بجے کے دوران۔" ڈاکٹر بولا۔

"دو اور اڑھائی بجے کے درمیان۔ جی نہیں، یہ قتل ٹھیک پونے تین بجے ہوا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اس طرح کہ جس وقت یہاں یہ قتل ہو رہا تھا، اس وقت عرفان غازی صاحب مجھے فون پر اطلاع دے رہے تھے کہ ان کے سامنے والے مکان میں کچھ گڑبڑ ہے، پھر میں نے فون پر ایسی آواز بھی سنی تھی جیسے کسی کا گلا کاٹا گیا ہو اور نرخرے سے آواز نکل رہی ہو۔ اس وقت پونے تین بج رہے تھے اور ہم یہاں تین بجے پہنچ گئے تھے، لہٰذا میں قتل کا درست وقت بتا سکتا ہوں۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ آپ کا خیال بالکل درست ہو۔ خیر پوسٹ مارٹم کے بعد قتل کا قریب ترین وقت معلوم ہو جائے گا۔"

"جی ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے، یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے، لہٰذا چلنا چاہیے۔"

دوسرے دن وہ قصبہ جالوم پہنچ گئے۔ یہ ایک سرحدی قصبہ تھا اور اس کے رہنے والے لوگ بہت سخت گیر اور تیز مزاج کے تھے۔ ہوائی اڈے سے اتر کر انہوں نے سیدھے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ ہوٹل کا نام گلنار ہوٹل تھا۔ اس میں کمرے حاصل کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ اپنا سامان اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے اور پھر ٹھٹک کر رہ گئے۔

کمرے میں چار آدمی موجود تھے اور ان کے پستول ان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اُن کے نام

''خوش آمدید دوستو۔''

''وعلیکم خوش آمدید۔ اس قصبے میں خوش آمدید کہنے کا طریقہ پسند آیا۔'' فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

''شاید تم لوگ ان پستولوں کو نقلی خیال کر رہے ہو۔'' ان میں سے ایک نے غرا کر کہا۔

''نہیں تو یہ تو بالکل اصلی ہیں۔'' فاروق بولا۔

''تب پھر تم ہاتھ اوپر اٹھا دو۔''

''کیا خیال ہے ابا جان، ہم ہاتھ اوپر اٹھائیں یا نہیں۔''

''اٹھا دو بھئی، ان کا دل میلا نہ کرو۔ ذرا دیکھیں تو سہی، یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

''ابھی ایک منٹ کے اندر معلوم ہو جائے گا۔'' وہی بولا۔

''کیا معلوم ہو جائے گا؟'' انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟''

''تو تمہیں ہماری آمد کے بارے میں خبردار کر دیا گیا تھا۔'' انسپکٹر جمشید چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔

''نہیں تو۔ ہم دراصل نجومی ہیں۔'' وہ طنز بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

''اوہ، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ کتنے دن ہو گئے تھے کسی نجومی کو ہاتھ دکھائے۔'' فاروق خوش ہو گیا۔

''فکر نہ کرو، اب جی بھر کر ہاتھ دکھانا۔'' وہ ہنسا، پھر اپنے ایک ساتھی کی طرف مڑا:

''گوگڑ، ان کی تلاشی لو۔ ان کے پاس پستول ضرور ہوں گے۔''

''صرف میرے پاس پستول ہے۔ کہو تو خود ہی نکال کر تمہاری طرف پھینک دوں۔''

''خبردار، حرکت نہ کرنا۔ ہمیں بتایا گیا ہے، تم لوگ بہت خطرناک ہو۔''

''لیکن شاید اس نے مکمل تعارف نہیں کرایا، ورنہ تم صرف چار نہ آتے ہمارے استقبال کے لیے۔'' محمود مسکرایا۔

''فکر نہ کرو، ہم چار ہی بہت ہیں۔ گوگڑ تم نے کام شروع نہیں کیا۔''

''ابھی لو استاد۔'' تین میں سے ایک نے کہا اور ان کی طرف بڑھا۔

''تلاشی سے پہلے اگر تم یہ بتا دیتے کہ چاہتے کیا ہو تو یہ تمہارے حق میں بہتر تھا۔''

''بعد میں بتا دینے میں ہمارے لیے کیا حرج ہے۔''

''اس وقت تم شاید بتانے کے قابل ہی نہیں رہ جاؤ گے۔''

''اپنے بارے میں بہت خوش فہمی میں مبتلا ہو شاید۔''

''یہ بات نہیں۔ ہم دراصل تمہارے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔'' فرزانہ نے بہت دیر بعد زبان کھولی۔

اتنے میں گوگڑ انسپکٹر جمشید کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تلاشی لینے کے لیے اسے

اپنا پستول جیب میں رکھنا پڑا تھا۔ جوں ہی وہ ان کے نزدیک پہنچا، زور سے اچھلا اور اپنے تینوں ساتھیوں پر جا پڑا۔ ساتھ ہی ان کے پستول چل گئے اور بیک وقت تین گولیاں گوگڑ کے جسم میں اتر گئیں۔ پستول بے آواز تھے۔ تینوں گر کر سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ وہ چاروں ان پر جا پڑے اور آن کی آن میں ان کے مزاج ٹھکانے لگا دیے، اب پستول ان کے ہاتھوں میں نظر آئے۔ وہ تینوں ہکا بکا ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اب کیا خیال ہے دوستو؟'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''تمہاری موت تمہیں اس قصبے میں کھینچ لائی ہے۔ تم نہیں جانتے، کہاں آ پھنسے ہو۔''

''کیا تم لوگ جملات کے آدمی ہو؟'' انہوں نے اس کے جملے کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔

''ہاں، ہم جملات کے آدمی ہیں، تو پھر.....''

''جملات کو اکبر بھورانی سے کیا دشمنی ہے؟''

''ہم تمہارے سوالات کے جواب دینے یہاں نہیں آئے تھے۔'' استاد نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''تو پھر کس لیے آئے تھے؟'' فاروق جلدی سے بولا۔

''تمہارا کام تمام کرنے، اور وہ ہم ہر حال میں کریں گے۔''

''تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے ہاتھ اور پیر بندھوا لو، پھر میں ہوٹل کے منیجر کو فون کر کے پولیس کو بلوا لوں گا اور تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ دوسری صورت میں تمہاری لاشیں یہاں تڑپتی نظر آئیں گی۔'' اس بار ان کا لہجہ سرد تھا۔

''تو تم ہوٹل کے منیجر کے ذریعے پولیس کو بلاؤ گے اور ہمیں اس کے

حوالے کرو گے۔'' استاد نے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔

''ہاں کیوں، کیا یہ ناممکن ہے۔''

''اچھی بات ہے، لو ہم ہاتھ اٹھائے دیتے ہیں۔ چلو بھئی تم دونوں بھی ہاتھ اٹھا دو۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی تینوں کے ہاتھ اٹھ گئے۔

''محمود، فاروق، تم ان تینوں کی تلاشی لو۔ فرزانہ، تم پوری طرح چوکس رہو۔''

''آپ فکر نہ کریں ابا جان، جونہی ان میں سے کسی نے حرکت کی، میرے پستول سے گولی نکلی۔'' وہ بولی۔

محمود اور فاروق نے بہت پھرتی سے تلاشی لے ڈالی۔ ان کی جیبوں سے چاقو، نائیلون کی رسی اور نقلی ڈاڑھی مونچھیں برآمد ہوئیں۔

''بھئی واہ، ہر کام تیار رکھتے ہیں یہ لوگ۔'' فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

''اور کیا تمہاری طرح، ہر بار گھر سے بغیر ہتھیاروں کے نکل آتے ہو۔'' فرزانہ جل کر بولی۔

''اور تم تو جیسے اپنا ہپ لے ہی آئی ہو۔'' فاروق نے بھنا کر کہا۔

''باتیں نہیں، صرف کام۔ اب تم ان کے ہاتھ اور پیر انہی کی رسی سے باندھ دو۔ یوں بھی ہمارے پاس رسی نہیں ہے۔''

دونوں انہیں باندھنے لگے۔ ہاتھوں اور پیروں کے بعد انہوں نے ان کے منہ بھی باندھ دیے، تاکہ شور نہ مچا سکیں۔

''آؤ بھئی اب چلیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی کیا مطلب، بہت دیر ہو گئی ہے، ہمیں کہاں جانا ہے؟'' محمود نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"اس ہوٹل سے دور۔" وہ بولے۔

"لیکن ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے، ہوٹل کے منیجر کو بلا کر انہیں قانون کے حوالے کریں گے۔" فاروق بولا۔

"احمق ہو تم۔ ان لوگوں کا ہم سے پہلے اس کمرے میں موجود ہونا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ہوٹل کا منیجر اور عملہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے یا یہ لوگ ساتھی ہیں، گویا ہم اس وقت دشمن ہوٹل میں ہیں۔ منیجر کو بلانے کا ذکر تو میں نے انہیں خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے کیا تھا اور یہ خوش فہمی میں مبتلا ہو بھی گئے۔ اسی لیے تو انہوں نے خود کو آسانی سے بندھوا لیا، آؤ اب چلیں، ان کے ساتھی آتے ہی ہوں گے۔"

"لیکن ہم جائیں گے کیسے۔ ہمیں فرار ہوتے دیکھ کر ہوٹل والے رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔"

"ہم پچھلے دروازے سے جائیں گے۔" وہ مسکرائے۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہی انہوں نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید بولے:

"کسی سستے سے ہوٹل میں لے چلو بھئی۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

"اکبر بھورائی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں آپ؟" اچانک انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

ڈرائیور کے ہاتھ کانپ گئے۔ ٹیکسی لہرائی، لیکن پھر سڑک کے درمیان آ گئی۔ ڈرائیور نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

"آپ ڈر گئے۔ آخر یہ اکبر بھورائی کیا بلا ہے؟"

"آپ اسے خوف ناک بلا کہہ سکتے ہیں، اس قصبے کی بیس پچیس سال پرانی خوف ناک بلا۔ آج تک پولیس اسے گرفتار نہیں کر سکی۔"

"لوگ اس سے خوف زدہ کیوں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"کہنے کو یہ قصبہ ہمارے ملک میں شامل ہے۔ ملک کا سکہ اس میں چلتا ہے۔ یہاں پولیس ہے، دوسرے تمام محکمے ہیں۔ ان محکموں میں حکومت کے احکامات کے مطابق کام ہوتا ہے، لیکن حقیقت دراصل یہ ہے کہ اس قصبے پر اکبر بھورائی کی حکومت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ پولیس اور دوسرے محکموں کے آفیسرز اس کے احکامات کے خلاف دم نہیں مار سکتے۔ محکموں کو اس کی طرف سے ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ پچیس سال پہلے زندگی میں پہلی بار لوگوں نے اکبر بھورائی کا نام سنا تھا، جب ایک رئیس کو اس کا خط ملا تھا۔ میں ان دنوں اس رئیس کا ڈرائیور تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ نور دین موچی کو فوری طور پر بیس ہزار روپے ادا کر دیے جائیں، ورنہ رئیس کا لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔ اس نے نور دین موچی کو بیس ہزار روپے نہ دیے۔ اس خط کو ایک مذاق خیال کیا اور چند روز بعد اس کے کارخانے میں آگ لگ گئی، ایسی آگ جو بجھائے نہ بجھی اور سب کچھ راکھ کر گئی۔ رئیس کنگال ہو گیا۔ مجھے بھی اس کی ملازمت چھوڑنا پڑی۔" ڈرائیور حسرت بھرے لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"اس رئیس کا نام کیا تھا؟" محمود بے چین ہو کر بولا۔

"تیمور ایاز۔ جب اس کا کارخانہ جل کر راکھ ہو گیا تو چند دن بعد ایک اور سیٹھ انعاریہ کو اکبر بھورائی کا خط ملا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ نور دین موچی کو بیس ہزار روپے دے دیے جائیں۔ سیٹھ لوگ پہلے ہی سہمے ہوئے تھے، اس نے فوراً نور دین موچی کو بیس ہزار روپے دے دیے۔"

"اور یہ نور دین موچی کون تھا؟"

"بس ایک موچی تھا۔ قصبے کے چوک میں بیٹھ کر جوتیاں گانٹھا کرتا تھا۔ اب تو اس کا جوتے بنانے کا ایک کارخانہ ہے۔" اس نے کہا۔

"تو کیا پولیس نے اس سے پوچھ گچھ نہیں کی کہ اس کا اکبر بھورانی سے کیا تعلق ہے، وہ کیوں اسے رقم دینے پر تلا ہوا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"بالکل کی تھی۔ پولیس والے تو اسے کئی دن تک کریدتے رہے تھے۔ نوردین نے سب کو یہی جواب دیا، میں تو خود حیران ہوں کہ یہ اکبر بھورانی کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، مجھے پیسے کیوں دلانا چاہتا ہے اور یہ کہ اسے اس بیس ہزار روپے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بے شک یہ اس سے واپس لے لیے جائیں۔ پولیس نے دوسرے سیٹھ سے مشورہ کیا، لیکن وہ کسی طرح رقم واپس لینے پر تیار نہ ہوا۔ لہٰذا پولیس نے بھی رقم موچی کے پاس ہی رہنے دی۔ ان دو واقعات کے بعد تو گویا سارا قصبہ اکبر بھورانی کے خطوط کی لپیٹ میں آ گیا۔ عام طور پر لوگوں کو اس کے چار خط ملتے ہیں۔ پہلے تین خط ملنے پر بھی اگر اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی جاتی تو چوتھے خط کے بعد اس شخص کی زندگی کا چراغ بجھا دیا جاتا ہے اور اب تو اکبر بھورانی کے حکم کو شہر کے آفیسر تک مانتے ہیں، سب اس سے لرزتے ہیں، پولیس آج تک اس کا سراغ نہیں لگا سکی۔"

"حیرت انگیز کہانی ہے۔ آپ نے ہمیں بہت قیمتی باتیں بتائی ہیں، بہت بہت شکریہ۔ ارے، لیکن آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ آپ تو شہر سے باہر نکل آئے۔"

"اکبر بھورانی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بھی اتفاق سے ان کا ایک معمولی سا کارندہ ہوں۔ انہوں نے مجھے ہدایت دی تھی کہ ہوٹل گلنار کے پچھلے حصے کی طرف موجود رہوں، کیونکہ آپ ان کے آدمیوں کو چوٹ دے کر ادھر سے نکلنے کی

کوشش ضرور کریں گے، لہٰذا میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆

چند لمحے تک سناٹا طاری رہا، صرف ٹیکسی کی آواز سنائی دیتی رہی۔ آخر انسپکٹر جمشید پرسکون آواز میں بولے:

"تو کیا اکبر بھورانی اب لوگوں کے سامنے آنے لگا ہے؟"

"نہیں، انہیں آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ مجھے تو ہدایت صرف یہ ہے کہ آپ کو اس جگہ پہنچا دوں، جہاں اکبر بھورانی خود آپ سے بات کر سکیں گے۔"

"تو کوئی ایسی جگہ بھی موجود ہے۔"

"ہاں، وہ آ گئی سامنے۔" اس نے اشارا کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے دیکھا، وہ ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے نیچے اترے بغیر کہا:

"اندر چلے جائیے اور اکبر بھورانی سے بات کر لیجیے۔"

"لیکن ہم اس سے کس طرح بات کر سکتے ہیں، جب کہ اسے اپنی آنکھوں سے مردہ دیکھ چکے ہیں۔"

"وہ اکبر بھورانی نہیں تھا۔ اس نے تو یہاں سے فرار ہو کر اکبر بھورانی کے نام سے ایک مکان میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اکبر بھورانی نے اپنے ایک کارندے کی ڈیوٹی لگائی کہ اسے ختم کر دیا جائے۔ دراصل وہ شخص باغی ہو گیا تھا۔ پچیس سال سے اکبر بھورانی کے گروہ کا کارکن تھا۔ اب آ کر بدظن ہو گیا اور یہاں سے فرار ہو گیا، لیکن اکبر بھورانی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس سے بچ کر اس کا کوئی کارکن نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہ بھی مارا گیا۔"

"تو پھر اس کا اصل نام کیا تھا؟"

"جملات۔" اس نے کہا۔

"کیا کہا، جملات۔" فرزانہ چیخ اٹھی۔

"ہاں، اس کا نام جملات تھا۔ اب ہم اسے باغی جملات کہتے ہیں۔"

"لیکن جملات کے نام سے تو مقتول کو خط ملتے رہے ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ جملات نے اپنا نام اکبر بھورانی رکھ لیا تھا، لہٰذا اکبر بھورانی کے آدمی نے شرارتاً اپنا نام جملات رکھ لیا تھا اور اسی نام سے خط لکھتا رہا۔ جملات نے اس سے ملاقات کرنا اور بات چیت کرنا منظور نہ کیا۔ یہاں تک کہ اسے چوتھی دھمکی بھی دے دی گئی۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، آپ جانتے ہی ہیں اور ہاں اندر جانے سے پہلے یہ خط لے لیجیے۔" ڈرائیور نے پراسرار انداز میں کہا۔

"خط، کیسا خط؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"اکبر بھورانی کی طرف سے چند ہدایات۔ ان ہدایات کے تحت آپ ان سے بات کر سکیں گے۔ اب اندر جائیے۔"

"آؤ بھئی اندر چلیں۔" انسپکٹر جمشید طنزیہ لہجے میں بولے۔

چاروں ڈاک بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔ جوں ہی اندر داخل ہوئے، انہوں نے ٹیکسی چلنے کی آواز سنی۔ دوڑ کر واپس دروازے پر آئے تو ٹیکسی جا چکی تھی۔ وہ مڑے اور اندر آ گئے۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ فون بھی نہیں تھا، جس کے ذریعے وہ اکبر بھورانی سے بات کر سکتے۔

"تو یہ صرف دھوکا تھا، یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"خط تو کھول کر دیکھیے۔" فاروق بے چین ہو کر بولا۔

انہوں نے خط کھولا، کاغذ پر لکھا تھا:

"مسٹر جمشید،

یہ میرا پہلا خط ہے، اس کے ملتے ہی دارالحکومت کا ٹکٹ کٹا لیں۔ بصورت دیگر آپ کو دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا خط ملے گا اور اس کے بعد وہی ہو گا، جو جملات کا ہوا۔

اکبر بھورانی"

☆☆☆

واپسی

وہ چند لمحے تک خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
آخر فاروق کی آواز ابھری:

''ابا جان، آپ تو یہاں اکبر بھورانی کے قتل کا معما حل کرنے کی نیت سے آئے تھے، لیکن یہاں اکبر بھورانی ہمیں دھمکی دے رہا ہے۔ یہ کیا الٹ پھیر ہے۔''

''ہم پچیس سال پرانے ایک مجرم گروہ سے ٹکر لے بیٹھے ہیں۔ ایک ایسے گروہ سے، جس کے اشاروں پر ہی سارا قصبہ ناچتا ہے۔ اسی لیے تو ہوٹل گلنار کے کمرے میں پہلے سے چار دشمن موجود تھے اور یہ ٹیکسی والا ہوٹل کے پچھلے دروازے پر ہمارے استقبال کے لیے تیار تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''تو پھر آئیے، واپس چلیں۔ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔'' فاروق بولا۔

''بزدل ہو تم۔'' فرزانہ بھنا اٹھی۔

''بلکہ ڈرپوک بھی ہو۔'' محمود نے بھی فرزانہ کا ساتھ دیا۔

''تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم چاروں پورے گروہ اور سارے قصبے سے بھڑ جائیں اور موت کو آواز دے بیٹھیں۔ کیا یہ عقل مندی کا تقاضا ہو گا ابا جان؟'' فاروق نے بھی تیز آواز میں کہا۔

''نہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''تت، تو کیا آپ واپس جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟'' محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں بھئی، ان حالات میں ہم چاروں کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' وہ بولے۔

''تو کیا آپ اس گروہ کو اسی طرح چھوڑ دیں گے۔'' فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

''میں تو اس وقت صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اکبر بھورانی کا آدمی حملات کے کمرے میں کس طرح پہنچا تھا؟''

''لیکن ابا جان، اب اس کی کیا ضرورت، بس وہ پہنچ گیا تھا کسی طرح۔''

''ضرورت ہے۔ آؤ واپس چلنے سے پہلے نوردین موچی، تیمور ایاز اور سیٹھ انعار یہ سے ملتے چلیں۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔'' انھوں نے کہا۔

''قصبے میں نوردین موچی ایک مشہور آدمی تھا۔ اس کا پتا فوراً ہی معلوم ہو گیا۔ جلد ہی وہ اس کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ اس کی کوٹھی بہت خوب صورت اور بڑی تھی۔ دستک دینے پر ایک ملازم باہر نکلا اور انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ جلد ہی ایک موٹے قد کا بھدا سا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر بہت قیمتی لباس تھا۔ انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگ مگا رہی تھیں۔

''فرمائیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ پہلے تو تعارف ہو جائے۔''

''میں انسپکٹر جمشید ہوں۔ یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ ہم دارالحکومت سے آئے ہیں۔''

''چلیے، یہ تو معلوم ہو گیا۔ فرمائیے، مجھ سے کیا کام ہے۔ ارے ہاں، آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کس چیز کے انسپکٹر ہیں؟''

"محکمہ سراغرسانی کے۔" وہ بولے۔

"اوہو اچھا، ہاں تو میرے پاس کس سلسلے میں آئے۔"

"پچیس سال پہلے کے واقعے کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب اس واقعے سے ہے جب آپ کو اکبر بھوراتی نے بیس ہزار روپے دلوائے تھے۔"

"پچیس سال بعد آپ کو اس واقعے کی تفصیل جاننے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں یہ باتیں آج ہی معلوم ہوئی ہیں۔"

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟" اس کے لہجے میں ناگواری آ گئی۔

"ایک ایک بات جو آپ بتا سکتے ہیں۔ آخر اکبر بھوراتی آپ کو کس طرح جانتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے آپ کو رقم کیوں دلوائی۔"

"ان باتوں کا جواب تو خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ اکبر بھوراتی بھی میرے سامنے تو آیا نہیں کہ میں اس سے پوچھ سکتا۔"

"تو آپ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔"

"جی نہیں، پولیس نے بھی مجھے ان دنوں بہت کریدا تھا، لیکن میں بھلا کیا بتاتا۔ میرے پاس بتانے کے لیے تھا ہی کیا۔"

"تب تو ہم نے آپ کو ناحق تکلیف دی۔ اجازت دیجیے، ہم چلتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکلے۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر آدمی ٹیکسی سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھا اور ان پر ایک نظر ڈالتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ عین اسی وقت اس آدمی نے بھی مڑ کر ان کی طرف دیکھا، پھر جلدی سے منہ پھیر کر چلا گیا۔

"کیوں بھئی، کیا خیال ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس شخص کو کہیں دیکھ چکے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن کہاں دیکھ چکے ہیں۔" فاروق نے اُلجھ کر کہا۔

"ذہنوں کو گردش دو۔ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ذرا دیکھوں تو سہی، کون پہلے بتاتا ہے۔" انسپکٹر جمشید شریر انداز میں بولے۔

"تو کیا آپ کو یاد آ چکا ہے۔"

"ہاں بالکل، بلکہ بہت اچھی طرح یاد آ چکا ہے کہ ہم اسے کہاں دیکھ چکے ہیں۔" انہوں نے پراسرار لہجے میں کہا اور سڑک کی طرف مڑ گئے۔ جلد ہی انہیں ایک ٹیکسی مل گئی اور پندرہ منٹ بعد وہ سیٹھ تیمور ایاز کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

اب وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ دستک دینے پر فوراً ہی باہر نکلا اور پھر انہیں ایک گھٹیا طرز پر سجے ہوئے کمرے میں لا بٹھایا۔ ہر چیز سے غربت ٹپک رہی تھی۔

"تو پچیس سال سے آپ خود کو سنبھال نہیں سکے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ اکبر بھوراتی والے واقعے کے بعد آپ کے حالات خراب ہی چلے آ رہے ہیں۔"

"ہاں، کارخانہ جلنے کے بعد میں کہیں کا نہیں رہا۔ مختلف اداروں کی بڑی بڑی رقمیں ادا کرنا تھیں جو کارخانہ چلتے رہنے کی صورت میں ادا ہوتی رہتیں۔ کاروباری

چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے، لیکن جوں ہی کارخانہ جلا سب لوگوں نے ایک ہی وقت میں اپنی رقموں کا مطالبہ شروع کر دیا اور بنک میں میرے پاس جس قدر نقدی اور زیورات تھے سب کے سب ان کی نذر ہو گئے۔ کوٹھی اور کار فروخت کر دی گئی۔ اور یہ چھوٹا سا مکان کرائے پر لینا پڑا۔ اب میں ایک دفتر میں بطور کلرک ملازم ہوں۔" اس کی آواز میں بہت درد تھا۔

"افسوس، آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ اکبر بھورانی نے بہت زیادتی کی۔"

"یہ زیادتی اس نے نہیں کی۔ خود میں نے ہی اپنے ساتھ کی۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟" محمود نے چونک کر کہا۔

"دولت کے ہوتے ہوئے بھی کبھی خدا کو یاد نہیں کیا۔ اس کا شکر یہ ادا نہیں کیا۔ اپنی دولت میں سے زکوٰۃ نہیں نکالی، حج نہیں کیا، نماز نہیں پڑھی، روزے نہیں رکھے، بس دولت کے نشے میں چور رہا۔ اب دولت نہیں ہے۔ بس پانچ وقت کی نماز پڑھ لیتا ہوں۔ روزے رکھتا ہوں۔ زکوٰۃ ادا کرنے اور حج کرنے کے قابل کہاں رہا۔"

"کیا آپ اکبر بھورانی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"بھلا میں اس کے بارے میں کیا بتا سکوں گا۔ میں تو آج تک یہ سوچتا ہوں۔ آخر اکبر بھورانی کون ہے اور مجھ سے کیا دشمنی تھی؟"

"شکریہ جناب، ہم نے آپ کو بہت زحمت دی۔ اب ہم چلیں گے۔"

اور وہ باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیٹھ انجاریہ کے پاس بیٹھے تھے، لیکن اس سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس نے صرف اتنا ہی بتایا:

"سیٹھ تیمور ایاز کا کارخانہ جلنے پر میں خوف زدہ ہو گیا تھا، لہٰذا میں نے

اکبر بھورانی کا پہلا خط ملتے ہی اسی موچی کو بیس ہزار روپے دے دیے اس کے بعد اکبر بھورانی نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ میں تو شکر کرتا ہوں کہ بیس ہزار روپے دے دیے تھے، ورنہ آج میں بھی تیمور ایاز کی طرح کنگال ہوتا۔"

باہر نکلتے ہی انسپکٹر جمشید نے ان سے پوچھا:

"کیوں بھئی، اس آدمی کے بارے میں کچھ یاد آیا جو نور دین موچی کی کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔"

"جی، ابھی تک تو نہیں۔" محمود نے کندھے اچکائے۔ فاروق اور فرزانہ نے بھی نفی میں سر ہلائے۔

"تو پھر آؤ، واپس چلیں۔ کہیں ہمیں دوسرا خط نہ مل جائے۔"

"تو کیا آپ واقعی واپسی کا ارادہ کر چکے ہیں؟"

"ہاں بھئی، پورے قصبے سے ہم نہیں لڑ سکیں گے۔ ہم مدد لے کر پھر یہاں آئیں گے۔"

"مدد، آپ اور مدد لے کر آئیں گے۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی، کیونکہ وہ ہمیشہ بھیڑ بھاڑ سے دور رہتے تھے۔

"ہاں، لیکن تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اپنے ساتھ پوری فوج لانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ آؤ، دیکھ ہی لو گے۔"

"دارالحکومت پہنچتے ہی انہوں نے فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

☆☆☆

عرفان غازی

''ہیلو خان رحمان، کیا حال چال ہیں؟''

''ہائیں جمشید، یہ تم ہو۔ لیکن نہیں، تم تو قصبہ جالوم گئے ہوئے ہو۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی بھابی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کا مطلب ہے، تم کوئی نقلی جمشید ہو۔ خبردار، تم مجھے دھوکا ہرگز نہیں دے سکتے۔''

''ارے ارے خان رحمان، تمہیں کیا ہو گیا ہے، میں اصلی جمشید ہوں اور ابھی ابھی قصبہ جالوم سے آیا ہوں۔ اگر یقین نہیں تو آ کر مجھ سے مل لو، یوں بھی تمہیں آنا تو پڑے گا۔ ایک اہم مہم درپیش ہے۔''

''اہم مہم، بس تو پھر میں پہنچ گیا سمجھو۔''

''ہاں، جلدی کرو، ابھی میک اپ کے مرحلے سے بھی گزرنا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''ارے باپ رے۔'' انہوں نے بوکھلا کر کہا، کیونکہ میک اپ سے وہ بہت گھبراتے تھے۔

''فکر نہ کرو، زیادہ مشکل میک اپ نہیں ہوگا۔ آدھ گھنٹے میں فارغ کر دوں گا۔'' وہ بولے۔

''اچھا، میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

''کیا پروفیسر انکل کو بھی لے چلیں گے۔''

''نہیں بھئی، مہم خطرناک ہے اور اس مہم میں ان کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ کوئی سائنسی معاملہ نہیں ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' فرزانہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

آدھ گھنٹے بعد خان رحمان پہنچ گئے، لیکن وہ تنہا نہیں آئے تھے۔ پروفیسر داؤدان کے ساتھ تھے۔

''ہائیں خان رحمان، میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ پروفیسر صاحب کو بھی ساتھ لانا۔''

''میں یہاں آنے کی تیاری میں مصروف تھا کہ یہ میرے ہاں پہنچ گئے۔ یہاں آنے کے بارے میں سنا تو یہ بھی آنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس میں میرا کیا قصور۔''

''قصور تو خیر میرا بھی نہیں ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج کے دن میرا یہاں داخلہ منع ہے۔'' پروفیسر داؤد منہ بنا کر بولے۔

''یہ بات نہیں پروفیسر صاحب، ہم دراصل ایک خطرناک مہم پر روانہ ہو رہے ہیں اور میں آپ کو خطرے میں بلاوجہ ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ملک اور قوم کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔''

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔ جب تک میری موت نہیں آ جاتی، کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے، لہٰذا تم فکر نہ کرو۔ میں اس خطرناک مہم میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اچھا جیسے آپ کی مرضی۔'' انہوں نے مجبوری کے عالم میں کندھے اچکائے۔

اب میک اپ کا کام شروع ہوا۔ دو گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد انسپکٹر جمشید نے سب کے حلیے بدل کر رکھ دیے۔ ایسے میں فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا:

"ابا جان، کیا مہم پر صرف ہم لوگ ہی جائیں گے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ کیا آپ قصبہ جالوم سے صرف انکل خان رحمان کو لینے کے لیے آئے تھے؟"

"نہیں بھئی، ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں گے، لیکن وہ خفیہ طور پر ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

"کیا ان میں انکل اکرام بھی شامل ہوں گے۔" محمود نے پوچھا۔

"نہیں، ہم میں سے ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ ابھی مجھے حکام بالا کو بھی تمام حالات بتانا ہیں، کیونکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اکبر بھورانی کے حکم پر سارا قصبہ ہمارے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ اس صورت میں ہمیں فوج کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"اوہ۔" وہ دھک سے رہ گئے۔ یہ معاملہ تو بہت بڑا معاملہ بن گیا تھا اور ایک شخص کے قتل سے شروع ہوا تھا۔

انسپکٹر جمشید ایک بار پھر فون پر جت گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد فارغ ہوئے، پھر انہوں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا:

"اس سے پہلے کہ ہم قصبہ جالوم کی طرف روانہ ہوں، پہلے جائے واردات کا ایک بار پھر معائنہ کر لیا جائے۔"

"لیکن ابا جان، اب اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"بہت ضرورت ہے۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اکبر بھورانی دراصل کون ہے۔ اس وقت تک اس مہم میں ہرگز ہرگز کامیابی نہیں ہوگی، کیونکہ وہ تو

ہمارے پیچھے سارے قصبے کو لگا دے گا اور ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"تو کیا آپ کے خیال میں جملات کو ختم کرنے خود اکبر بھورانی آیا تھا؟"

"وہ نہیں آیا تھا، اس کا کوئی خاص آدمی ضرور آیا تھا اور اگر ہم اس خاص آدمی کا سراغ لگا لیں تو یہ بھی بڑی کامیابی ہوگی۔ ہم اس کے ذریعے اکبر بھورانی تک پہنچ سکیں گے۔"

پندرہ منٹ بعد وہ سب شاہین سٹریٹ پہنچ گئے۔ یہاں ماہرین کی ایک جماعت موجود تھی۔

"میں چاہتا ہوں، کمرۂ واردات کے ایک ایک انچ سے انگلیوں کے نشانات اٹھائے جائیں۔ شاید کسی جگہ مجرم کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں۔"

"جی بہتر۔" انہوں نے ایک ساتھ کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے، لیکن ایک گھنٹے کی محنت کے بعد انہوں نے بتایا:

"اس کمرے سے صرف جملات کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔"

"اچھا، میرے ساتھ آؤ۔" انہوں نے پراسرار انداز میں کہا اور ان سب کو لے کر سامنے والے مکان کے دروازے پر پہنچے۔ یہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے شاکر حمید سے عرفان غازی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا:

"یہ کل کہیں گئے تھے، اب تک لوٹ کر نہیں آئے۔"

"اچھی بات ہے۔ تالا توڑ دو اور اس گھر کے بھی چپے چپے سے انگلیوں کے نشانات اٹھا لو۔"

کام شروع ہو گیا۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید پورے مکان کی تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ حیران تھے کہ وہ کیا چیز تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ ایسے میں باورچی خانے کے ایک گھی کے ڈبے میں فاروق کو لوہے کے دو کافی موٹے

پائپ ملے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ دونوں پائپ ایک سرے سے مڑے ہوئے
تھے۔

"حیرت ہے، باورچی خانے میں لوہے کے ان پائپوں کا کیا کام۔" وہ
بڑبڑایا، پھر کچھ سوچ کر دونوں پائپ لیے اپنے ابا جان کے پاس پہنچا۔ اس وقت محمود
اور فرزانہ بھی یہیں تھے۔

"ابا جان، باورچی خانے میں یہ دو پائپ ملے ہیں۔ گتے کے ایک ڈبے
میں رکھے تھے۔ میں حیران ہوں کہ ان پائپوں کا وہاں کیا کام۔"

انسپکٹر جمشید چونک کر مڑے اور پھر ان کے چہرے پر جوش کے آثار نظر
آئے۔ انہوں نے چلا کر کہا۔

"وہ مارا، انہی کو تو میں تلاش کر رہا تھا۔"

☆☆

"جی کیا مطلب، آپ انہی کو تلاش کر رہے تھے۔"

"ہاں، تمہیں وہ آدمی تو یاد ہوگا، جسے ہم نے نورودین موچی کی کوٹھی میں
داخل ہوتے دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ میں نے تم لوگوں کو
دعوت بھی دی تھی کہ یاد کرنے کی کوشش کرو، اسے کہاں دیکھا ہے، لیکن تم نہ بتا سکے۔
دراصل وہ شخص عرفان غازی تھا۔ میں نے اسے چلنے کے انداز سے پہچانا۔ یہاں وہ
میک اپ میں تھا یا وہاں میک اپ میں رہا ہوگا۔ اسی لیے تمہیں صرف جانا پہچانا معلوم
ہوا۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں، اس میں ایک فی صد بھی شک نہیں کہ وہ عرفان غازی تھا۔"

"لل، لیکن ابا جان، آپ لوہے کے ان پائپوں کو کس سلسلے میں تلاش

کر رہے تھے۔ آپ کو کس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اس گھر میں کسی جگہ لوہے کے دو
پائپ بھی موجود ہیں۔"

"اسی کو سراغ رسانی کہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے: "جملات کے قتل
کی اطلاع ہمیں عرفان غازی نے دی اور عین اس وقت دی، جب اس کے بیان کے
مطابق اسے قتل کیا جا رہا تھا۔ میں نے فون پر غرغرے سے نکلتی آواز بھی سنی تھی، لیکن
ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قتل دو بجے سے اڑھائی بجے کے درمیان ہوا
ہے۔ جب کہ عرفان غازی نے مجھے فون پونے تین بجے کیا تھا۔ اس وقت پہلی بار
مجھے عرفان غازی پر شک ہوا۔ فرزانہ ربڑ کے ایک غبارے پر سے پھسلی تھی۔ میرے
ذہن میں وہ غبارہ بھی چبھنے لگا تھا، کیونکہ ان دونوں گھروں میں غبارے سے کھیلنے کے
لائق کوئی بچہ نہیں ہے۔ غبارے کے پاس جگہ گیلی بھی تھی، یعنی غبارہ گیلا تھا۔
میں سوچنے لگا، کیا عرفان غازی قاتل ہے۔ اگر قاتل ہے تو مقتول کے کمرے میں کس
طرح پہنچا۔ سیڑھی کھڑکی تک نہیں جاتی تھی۔ دونوں کھڑکیوں پر بھی نہیں ٹک سکتی تھی،
کیونکہ درمیانی فاصلہ زیادہ تھا، لہٰذا اس درمیانی فاصلے کو پورا کرنے کے لیے عرفان
غازی نے سیڑھی کے اگلے سروں میں یہ پائپ پھنسائے ان میں سوراخ بھی موجود
ہیں۔ سیڑھی کے دونوں بانسوں میں بھی سوراخ ہیں۔ اس نے ان کے درمیان نٹ
گزار کر انہیں کس دیا ہوگا، تاکہ پائپ نکل نہ جائیں، یہ پائپ آگے سے خم کھائے
ہوئے بھی ہیں، گویا کھڑکی پر ٹک کر کھسک نہیں سکتے۔ اس طرف اس نے سیڑھی کو
کھڑکی کے ساتھ رسی سے باندھ دیا ہوگا، اس طرح وہ جملات کے کمرے میں داخل
ہونے میں کامیاب ہوا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"اف خدا، تو یہ عرفان غازی اکبر بھوراتی کا کارکن ہے؟"

"یا تو کارکن ہے، یا پھر خود اکبر بھوراتی ہے۔"

''اوہ۔'' ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

☆☆☆
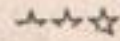
یہ کون ہے؟

چند لمحے تک خاموشی رہی، پھر فرزانہ نے حیرت زدہ انداز میں کہا:

''لیکن ابا جان، آپ نے اس غبارے کی اہمیت پر روشنی نہیں ڈالی؟''

''غبارے کو اندر سے گیلا کر کے اگر اس میں ہوا بھری جائے اور پھر اسے منہ کے پاس سے دو طرف سے پکڑ کر کھینچا جائے تو غبارے میں سے بالکل ایسی آواز نکلتی ہے، جیسے کسی کا گلا گھٹ گیا ہو اور آواز نرخرے میں سے نکل رہی ہو، گویا فون کرتے وقت عرفان غازی نے وہ غبارہ استعمال کیا تھا اور پھر اسے کھڑکی سے نیچے پھینک دیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا، بھلا ہم اس غبارے کی طرف کیا دھیان دیں گے۔ دوسرے یہ کہ سیڑھی کی لمبائی کم ہے، لہٰذا اس پر شک کیا ہی نہیں جا سکے گا، لیکن ڈاکٹر نے جو قتل کا وقت بتایا، اس کے مطابق میں عرفان غازی پر شک کر سکتا تھا، لہٰذا میرا شک غلط ثابت نہیں ہوا اور ثبوت کے طور پر یہ دو مڑے ہوئے پائپ بھی مل گئے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ حملات کا قاتل عرفان غازی ہے اور عرفان غازی کو ہم نوردین کے موچی کے ہاں دیکھ چکے ہیں، لہٰذا سب سے پہلے ہم وہیں جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی اور قدم اٹھائیں گے۔''

''بہت خوب، یہ تو معاملہ ہی بالکل صاف ہو گیا۔ اب صرف مجرم کی گرفتاری کا مسئلہ رہ گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اکبر بھورنی کی گرفتاری کا بھی۔

کیونکہ اصل مجرم تو وہی ہے اور اس کی گرفتاری بہت تیز حا کام ثابت ہوگا۔"

"ہاں، اس کی بہت امید ہے، کیونکہ پچیس سال سے اس شخص نے خود کو چھپا رکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ شخص بہت ذہین ہے، اپنے ذہن سے کام لے کر وہ اس وقت قصبے کا حکمران بن بیٹھا ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر دار الحکومت سے کسی محکمے کے آفیسر کے لیے کوئی احکامات جاتے ہیں تو وہ ان احکامات کی طرف توجہ بھی نہیں دے گا۔ ہاں، اگر اکبر بھورانی کا کوئی حکم آیا ہوا ہوگا اس کی تعمیل فوری طور پر کرے گا۔"

"واقعی حالات بہت نازک ہیں۔" خان رحمان بولے۔

عرفان غازی کے کمرے سے بھی انگلیوں کے نشانات اٹھا لیے گئے۔ بہت سی جگہوں سے اس کے نشانات مل گئے۔ اب ان کا یہاں کام ختم ہو گیا تھا اور ادھر قصبہ جالوم کے لیے پرواز کا وقت بھی ہو گیا تھا، لہٰذا انہوں نے ایئر پورٹ کا رخ کیا۔ یوں وہ خصوصی پرواز سے بھی جا سکتے تھے، لیکن انسپکٹر جمشید نے مناسب خیال نہیں کیا، کیونکہ وہ چاہتے تھے، اکبر بھورانی کے آدمی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ انسپکٹر جمشید اس وقت ایک اخباری رپورٹر کے بھیس میں تھے۔ ان سب کو ہوٹل گلنار میں کمرے مل گئے۔ انہیں وہاں چھوڑ کر انسپکٹر جمشید ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر نورودین سوچی کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی انہیں گئے دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت وہ ایک ہی کمرے میں موجود تھے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر محمود نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا، دروازے میں ایک لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ جھکا اور بولا:

"میں اس ہوٹل کا منیجر ہوں، مجھے ساروم کہتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ یہ ہوٹل آپ کا اپنا ہے۔ اسے اپنا گھر سمجھیں۔ بیرے ہر

خدمت کے لیے تیار ہیں۔ انہیں بلانے کے لیے ہر کمرے میں گھنٹی کے بٹن لگے ہوئے ہیں۔ بیرے دن رات گاہکوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں۔ کوئی الجھن پیش آئے تو میری خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔"

"جی ہاں، ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" فاروق بول اٹھا۔ محمود اور فرزانہ نے اسے تیز نظروں سے گھورا مگر اس نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ساروم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"ہم دراصل اپنے چند عزیزوں کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ اس قصبے میں کچھ عرصہ پہلے آئے تھے، واپس نہیں لوٹے۔ کیا آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو پولیس کا معاملہ ہے، آپ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں۔" منیجر نے کہا۔

"وہ تو خیر ہم کریں گے۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہیں کہ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔"

"تب بھی وہ میرے ہوٹل سے تو گم نہیں ہوئے ہوں گے۔ باہر ہی انہیں کوئی حادثہ پیش آیا ہوگا۔"

"گویا آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"جی نہیں، میں پولیس کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ کوئی ضرورت ہوئی تو آپ کو تکلیف دیں گے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے کہا، ایک بار پھر جھکا اور باہر نکل گیا۔

"یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہمارے کچھ عزیز گم ہو گئے ہیں۔" فرزانہ تلملا کر بولی۔

"میں یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ شخص کس حد تک ہماری مدد کر سکتا ہے۔" فاروق بولا۔

"اسے ہم پر شک ہو جائے گا۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ ضروری نہیں۔ میں نے ایک عام سی بات پوچھی تھی۔" فاروق نے بھی بھنا کر کہا۔

"حالات بہت نازک ہیں۔ ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ خاص طور پر ان حالات......"

محمود کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، چہرے پر خوف دوڑ گیا۔ رنگ سفید پڑ گیا۔

☆☆

انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی سے اتر کر نوردین موچی کے دروازے پر دستک دی۔ ایک منٹ بعد اسی ملازم نے دروازہ کھولا اور پھر انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نوردین موچی اندر داخل ہوا۔ انسپکٹر جمشید اٹھتے ہوئے بولے:

"اخبار عالم کے ایڈیٹر جے احمد سے ملیے۔ آپ کی شہرت مجھے اس قصبے میں کھینچ لائی ہے۔"

"میری شہرت، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو ایک موچی ہوں۔" اس نے منہ بنایا۔

"رہے ہوں گے پچیس سال پہلے۔ اب تو آپ جوتوں کے کارخانے کے

مالک ہیں۔" وہ بولے۔

"خیر خیر، آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟" اس نے ناخوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ اخبار عالم میں شائع ہوگا۔" انہوں نے کہا۔

"مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔ نہ جانے کتنی بار انٹرویو چھپ چکے ہیں۔"

"لیکن میں آپ کا جو انٹرویو شائع کروں گا، اس سے آپ کی شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگے گی۔"

"مجھے قطعاً ضرورت نہیں اپنی شہرت کو آسمان سے باتیں کروانے کی۔" وہ بولا۔

"بہت اچھا، اگر آپ پسند نہیں کرتے تو میں چلتا ہوں، لیکن ذرا اس تصویر کو دیکھیے، کیا آپ نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔" انہوں نے جیب سے عرفان غازی کی تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ یہ تصویر انہوں نے ایک آرٹسٹ سے تیار کرائی تھی، وہ بھی حلیہ بتا کر۔ تصویر دیکھ کر نوردین کی آنکھ میں الجھن کے آثار نمودار ہوئے، پھر اس نے کہا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس شخص کو میں نے کہیں دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے، یہ یاد نہیں آ رہا۔"

"مہربانی فرما کر یاد کرنے کی کوشش کیجیے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن آپ اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپ نے یہ بات کس طرح جان لی کہ اس شخص کا مجھ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے یا میں اس کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں۔"

"یہ سوال میں اس قصبے کے اور لوگوں سے بھی کروں گا۔ دراصل اس شخص کو اس قصبے میں دیکھا گیا ہے۔ اخباری رپورٹر ہوں نا۔ اگر کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کہاں چھپا ہوا ہے تو میرا اخبار لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوگا اور دھڑا دھڑ بکے گا، کیونکہ یہ شخص ایک قاتل ہے، اس نے دارالحکومت میں ایک شخص کو قتل کیا ہے۔"

"کیا؟" نوردین موچی نے چلا کر کہا، پھر اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔ کئی سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا:

"بہت بہتر جناب، میں اس بارے میں غور کروں گا۔ شاید مجھے یاد آجائے۔"

"بہت بہتر۔ میں ہوٹل گلنار میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ فون پر اطلاع دے سکتے ہیں۔"

"جی بہتر آپ فکر نہ کریں۔" اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید اٹھے ہی تھے کہ عرفان غازی دوسرے حلیے میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ یعنی اس حلیے میں، جس میں انہوں نے اسے نوردین کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

"تم۔ تم یہاں کیوں آگئے، چلو بھاگو۔" نوردین نے غرا کر کہا۔

"جج، جی اچھا۔" اس نے کانپ کر کہا اور فوراً کمرے سے نکل گیا۔

"یہ شخص کون ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ ایک پاگل شخص ہے۔ ہر وقت ادھر ادھر آوارہ گھومتا رہتا ہے۔ میرے ہاں بھی گھس آتا ہے۔ بہت تنگ آگیا ہوں اس سے۔"

انہیں بہت حیرت ہوئی۔ نوردین موچی عرفان غازی کے بارے میں جھوٹ بول رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ آخر اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

"اچھا جناب، میں نے آپ کو ناحق تکلیف دی۔ اب اجازت دیجیے۔"

"شکریہ۔" اس نے کہا اور وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ کوٹھی سے باہر نکل کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا، لیکن عرفان غازی انہیں کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی کوٹھی میں ہی ہے، لہٰذا وہ تیز تیز قدم اٹھاتے کچھ دور چلے گئے اور پھر واپس مڑ کر ایک ایسی جگہ کھڑے ہو گئے کہ نوردین کی کوٹھی کو نظر میں رکھ سکیں۔ حالات ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ شخص عرفان غازی کے علاوہ کوئی نہیں، پھر آخر اس کا نوردین موچی سے کیا تعلق ہے۔ کیا نوردین کا بھی اکبر بھورانی کے گروہ سے کوئی تعلق ہے۔ ضرور یہی بات تھی اور اسی لیے تو سب سے پہلے اسے رقم دلوائی تھی۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ انہوں نے عرفان غازی کو باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار تھے۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ایک طرف بڑھا۔ اسی وقت ایک ٹیکسی اس کے پاس سے گزری، اس نے ہاتھ کا اشارہ دے کر اسے روک لیا اور اس میں بیٹھنے لگا۔

انسپکٹر جمشید نے بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ انہوں نے اسے روکا اور جلدی سے بیٹھتے ہوئے بولے:

"اس ٹیکسی کے پیچھے چلیے۔ مجھے اس شخص سے بہت ضروری کام ہے، کہیں وہ نکل نہ جائے۔"

"نہیں نکل سکے گا جناب، آپ فکر نہ کریں۔" ڈرائیور نے کہا اور ٹیکسی پوری رفتار پر چھوڑ دی۔ انہیں خوف محسوس ہوا، کہیں ان کا ڈرائیور آگے نہ نکل جائے۔ چنانچہ فوراً بولے۔

"بھئی، اتنی تیز رفتاری کی ضرورت بھی نہیں۔ بس وہ ٹیکسی نظر میں رہنی چاہیے۔ جس جگہ وہ شخص ٹیکسی سے اترے گا، میں وہیں اس سے مل لوں گا۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور رفتار کم کر لی۔

یہ تعاقب پندرہ منٹ جاری رہا، پھر اگلی ٹیکسی ایک شان دار قسم کے مکان کے سامنے رکی۔ عرفان غازی اس سے اترا اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

"بس بھئی، مجھے بھی اسی مکان کے پاس اتار دیں، بہت بہت شکریہ۔"

انہوں نے بل ادا کیا اور نیچے اتر کر مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھی ہی تھی کہ دروازہ کھل گیا اور عرفان غازی کی صورت نظر آئی۔ جوں ہی اس کی نظر ان پر پڑی وہ خوف زدہ ہو گیا۔

"آپ مجھے دیکھ کر ڈر گئے شاید۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آ۔ آپ، یعنی کہ آپ......"

"ہاں بھئی، ابھی ابھی تو میں نوردین موچی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ آپ بھی وہاں آئے تھے۔ میں ایک اخبار کا رپورٹر ہوں۔ آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تت، تشریف لائیے۔" اس نے کانپ کر کہا۔

وہ اس کے ساتھ ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی انہوں نے اس کی وہ تصویر نکالی جو اندازے سے بنوائی گئی تھی۔

"اس شخص کو پہچانتے ہیں آپ؟"

اس نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے تصویر لی۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر کانپ کر بولا:

"نن، نہیں جناب۔ مم، میں اسے نہیں جانتا۔"

"کمال ہے عرفان غازی صاحب، آپ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی، کیا مطلب؟" عرفان غازی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا، لیکن اس کا پستول والا ہاتھ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

☆☆☆

خوف کا موقع

"کیا ہوا، تمہارا رنگ سفید کیوں پڑ گیا۔ آنکھوں میں خوف کیوں دوڑ گیا۔ کمرے میں کوئی بھوت ووت تو نظر نہیں آ گیا، لیکن نہیں، بھوتوں ووتوں سے ڈرنے والے اسے آسمان کہاں ہیں ہم۔ ہاں تو ضرور کوئی بات ہے، جلدی بتاؤ، میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ کیوں فرزانہ تمہارا کیا خیال ہے، تم بھی بہت پریشان ہو گئی ہو نا۔ اوہو، کمرے میں موجود بھی لوگ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں، خدا خیر کرے۔" فاروق روانی کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

"توبہ ہے، کوئی کچھ کہے تو تب نا، جب تم اپنی زبان میں کوئی روڑا اٹکاؤ۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"زبان میں اٹکانے کے لیے تو اچھے خاصے روڑے کی ضرورت ہو گی۔ اور ابھی......"

"یار خاموش رہو، پہلے یہ تو جان لینے دو کہ محمود خوف زدہ کیوں ہو گیا ہے۔" خان رحمان جھنجلا اٹھے۔

"جی بہتر، اگر آپ کہتے ہیں تو میں ہو جاتا ہوں خاموش، ورنہ آج میں خاموش رہنے والا نہیں تھا۔"

"فاروق، فاروق، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ موقع خوف کا ہے۔" پروفیسر

داؤد نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ۔" فاروق نے کانپ کر کہا اور اچانک اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے، پھر وہ بولا:

"دیکھیے، بالکل ٹھیک خوف زدہ نظر آ رہا ہوں نا؟"

"معلوم ہوتا ہے، اس وقت اس میں مذاق کی روح حلول کر گئی ہے۔ یہ حضرت نہیں مانیں گے، لہٰذا اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہاں محمود، جلدی بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟"

"مسٹر ساروم بلاوجہ نہیں آئے تھے۔" محمود بڑبڑایا۔

"وہ تو صاف ظاہر ہے۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لیے آئے تھے کہ ہمیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی نہیں، یہ بات نہیں۔ وہ خاص مقصد کے تحت آئے تھے اور ان کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ ہم......"

عین اسی وقت دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا۔ منیجر ساروم دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ اس کے پیچھے چار لمبے تڑنگے بدمعاش صورت آدمی تھے، پھر وہ اندر داخل ہو گئے اور دروازہ انہوں نے اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی:

"کون ہو تم لوگ؟"

"انسان، کیوں انکل، میں نے ٹھیک کہا نا۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"ہاں، ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ تمام مخلوقات سے بہتر مخلوق۔" خان رحمان بولے۔

"میں تم لوگوں کے نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"نام ہم رجسٹر میں لکھوا چکے ہیں۔ رجسٹر کھول کر پڑھ لیں، کیونکہ ہم اپنے نام بس ایک ہی بار بتایا کرتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"ان لوگوں کی مرمت کردو۔" ساروم اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

"لیکن کس خوشی میں۔ ہمارا تو کچھ بھی ٹوٹا پھوٹا ہوا نہیں ہے۔ ہمیں مرمت کا اتنا شوق بھی نہیں کہ بلا ضرورت ہی کرانا شروع کردیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یا تو تم اپنے اصل نام بتاؤ گے یا مرمت کراؤ گے۔" ساروم غرایا۔

عین اسی وقت کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ محمود فوراً فون کی طرف لپکا۔

"ٹھہرو، تم فون نہیں سنو گے۔" ساروم نے چیخ کر کہا۔

"تو اور کیا سنوں گا۔" محمود نے کہا اور ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

"ہیلو، یہ میں بول رہا ہوں۔"

"واہ، کیا جملہ ہے۔" فاروق چہکا۔

"ریسیور مسٹر ساروم کو دو۔" میں کاؤنٹر سے بول رہا ہوں۔" پیچھے سے کلرک کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اوہو، یہ تو واقعی میں نہیں سن سکوں گا، مسٹر ساروم فون آپ کا ہے۔"

اس دوران یوں بھی ساروم اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ریسیور ایک جھٹکے سے چھین لیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا:

"ساروم بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی، پھر اس نے اچھا کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اب اس کی نظریں ان پر بری طرح جم گئی تھیں۔

"خیر تو ہے مسٹر ساروم، کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمیں کھا جانے کا ارادہ ہے، لیکن میں آپ کو خبردار کیے دیتا ہوں کہ اس طرح آپ کی آنکھیں بدہضمی کا شکار ہو جائیں گی۔"

"کیا بکواس ہے اور تم نے سنا نہیں، میں نے کہا تھا، ان لوگوں کی مرمت شروع کردو۔" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر غرایا۔

وہ چاروں ان کی طرف بڑھے اور وہ بھڑک کر ادھر ادھر ہو گئے۔

"پروفیسر انکل، آپ ایک طرف ہو جائیے۔ اس لڑائی میں آپ کو حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ تو بس تماشا دیکھیے گا۔"

"اچھا اچھا۔" انہوں نے گھبرا کر کہا، پھر ایک کونے میں سمٹ گئے۔

محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان اب چار سمتوں میں کھڑے تھے۔ چاروں دشمن بھی ان کی طرف ایک ایک کر کے بڑھے۔

"مسٹر ساروم، اگر ان کے چوٹ ووٹ لگ گئی تو ہمیں الزام نہ دیجیے گا۔" فاروق نے گویا خبردار کیا۔

"بہت جلد تم زمین چاٹتے نظر آؤ گے، فکر نہ کرو۔"

"زمین چاٹنا بھی شاید محاورہ ہے۔ ایک تو ہر جگہ اور ہر موقعے پر محاورے ہمارے سامنے آ ٹپکتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔ اسی وقت اسے ایک مکا اپنی ٹھوڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔

"ارے باپ رے۔" اس نے بوکھلا کر کہا اور پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ نہ صرف بیٹھ گیا بلکہ فوراً ہی سر کی ایک ٹکر اس کے پیٹ میں دے ماری، بس پھر کیا تھا، وہ کمر کے بل دھڑام سے گرا۔ اتنی دیر میں خان رحمان اپنے مقابل آنے والے کو اٹھا کر پٹخ چکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر گرے۔

"بھئی، یہ کیا، تم تو آپس میں ہی لڑنے لگے۔" فاروق نے کہا۔

ادھر محمود جھکائی پر جھکائی دے رہا تھا اور اس کا مقابل گویا پھرکی کا ناچ ناچ رہا تھا۔ ایسے میں فرزانہ نے چکر کاٹا اور اپنی طرف بڑھنے والے دشمن کی گردن میں دونوں بازو ڈال کر لٹک گئی اور بازوؤں کو کسنے لگی۔ یہ اس کا پرانا حربہ تھا۔ اچانک دشمن نے ایک زوردار جھٹکا مارا۔ فرزانہ کے بازو کھل گئے اور وہ دھڑام سے دیوار سے جاٹکرائی۔ یہ دیکھ کر خان رحمان حرکت میں آئے۔ بلا کی پھرتی سے دشمن کا ایک بازو پکڑا اور جھٹکا دیا۔ وہ پوری قوت سے دیوار سے لگا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ فرش پر گر کر وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ عین اسی وقت خان رحمان پر پیچھے سے سارومم نے حملہ کیا۔ وہ ابھی تک صرف تماشائی بنا کھڑا رہا تھا۔ خان رحمان یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ لڑائی میں حصہ نہیں لے گا، لہٰذا بے خبری میں مارے گئے اور اوندھے منہ گرے۔ سارومم ان پر چڑھ دوڑا۔ محمود اور فاروق گھبرا گئے۔ دونوں اپنے اپنے دشمنوں کو چھوڑ کر سارومم کی طرف بڑھے اور سروں کی ٹکریں اس کی کمر پر دے ماریں۔ سارومم سنبھل نہ سکا، دھڑام سے گرا۔ اتنی دیر میں خان رحمان اٹھ چکے تھے۔ اب ان کے ہاتھ بجلی ایسی تیزی سے چلنے لگے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی پوری طرح حرکت میں آ گئے۔ اچانک سارومم نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی چیخیں گراتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ وہ اس کے ساتھیوں سے الجھے رہ گئے اور ابھی اس لڑائی کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے گرج دار آواز میں کہا:

"خبردار، سب لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"وہ ٹھٹک کر رک گئے اور پھر ان کے ہاتھ اوپر اُٹھ گئے، ساتھ ہی سارومم کی آواز سنائی دی:

"ان لوگوں نے میرے ایک ساتھی کا سر پھاڑ دیا ہے۔ میرے ساتھی ان سے صرف یہ معلوم کرنے آئے تھے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، بس یہ ان سے لڑ پڑے۔ یہ لوگ ضرور غنڈے اور بدمعاش ہیں، انہیں گرفتار کر لیں۔"

"ٹھیک ہے، چلو لگا دو ان کے ہتھکڑیاں۔" پولیس افسر نے کہا۔

"ٹھہریے جناب، یہ اتنا آسان نہیں۔" محمود نے بھنا کر کہا۔

"کیا اتنا آسان نہیں؟" پولیس افسر غرایا۔

"ہمیں ہتھکڑیاں پہنانا، کیونکہ مجرم ہم نہیں، یہ لوگ ہیں۔ انہوں نے ہمارے کمرے میں داخل ہو کر دنگا فساد کیا ہے۔"

"لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ سر سارومم کے ساتھی کا پھٹا ہوا ہے۔" پولیس افسر بولا۔

"لڑائی بھڑائی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہیں آ کر ہم پر حملہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"اس کا فیصلہ تھانے چل کر ہوگا کہ غلطی کس کی ہے۔ آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"تو پھر ہتھکڑیاں لگائے بغیر لے چلیے۔" خان رحمان نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگوں کو پہلے ہتھکڑیاں لگائی جائیں گے۔ اس کے بعد یہاں سے لے جایا جائے گا۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سارومم نے جلدی سے ریسیور اٹھایا، پھر بوکھلا کر ریسیور پولیس افسر کو دے دیا۔ پولیس افسر نے فون سنا اور پھر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کے منہ سے کانپتی آواز میں نکلا:

"اوہو، تم لوگ تو مسٹر بھورانی کے مجرم ہو۔ اب تو تمہیں بیڑیاں پہنا

کرلے جانا ہوگا۔"

"لیکن بیڑیاں آپ کے پاس کہاں ہیں؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم بیڑیوں کا انتظام کرلیں گے، فکر نہ کرو۔ مسٹر بھورانی کے مجرموں کے ساتھ یہاں کوئی رعایت نہیں برتی جاتی۔"

"اللہ رحم فرمائے، لیکن ہم نے بھورانی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"یہ تو مسٹر بھورانی ہی جانیں۔"

"تو کیا آپ لوگ مسٹر بھورانی کے ماتحت ہیں؟"

"یہ سارا شہر ان کے ماتحت ہے۔"

"تب تو ہم ان کے ماتحت نہیں۔ ہم دارالحکومت سے آئے ہیں۔"

"تم لوگ کہیں سے بھی آئے ہو، اس وقت قصبہ جالوم میں موجود ہو تم چاروں جاکر بیڑیاں لے آؤ۔" پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"جی بہتر۔" وہ مڑے اور کمرے سے نکل گئے۔ ایک منٹ تک خاموشی رہی، پھر محمود نے کہا:

"آیئے انکل، یہاں سے چلیں۔ یہاں تو قانون کے محافظ بھی قانون شکن کا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"ہاں چلو، آیئے پروفیسر صاحب۔" خان رحمان بولے۔

وہ پروفیسر صاحب کی وجہ سے ہی مجبور تھے، ورنہ اب تک کب کے بھاگ چکے ہوتے، لیکن اب جب کہ پولیس افسر کے ساتھی بیڑیاں لینے چلے گئے تھے اور کمرے میں صرف ساروم، اس کے ساتھی اور پولیس افسر رہ گئے تھے۔ وہ نکل بھاگنے کی کوشش کر سکتے تھے، تاہم انہیں یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اس طرح وہ اپنے والد سے جدا ہو جائیں گے، لیکن پولیس کے شکنجے میں جانے سے یہ بہتر تھا۔

انہوں نے دروازے کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ پولیس افسر نے گرجدار آواز میں کہا:

"خبردار، تم لوگ حرکت بھی نہیں کرو گے۔" یہ کہتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خان رحمان نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس کے کندھے سے جا ٹکرائے۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ محمود نے پروفیسر داؤد کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ ساروم کے ساتھی خان رحمان کی طرف جھپٹے۔

"فاروق، فرزانہ تم بھی نکل جاؤ۔"

"لیکن انکل، ہم آپ کو چھوڑ کر کس طرح چلے جائیں۔ محمود تو پروفیسر انکل کی وجہ سے مجبور تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد اب ہم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں، نکل جاؤ۔ میں بھی ان لوگوں کو چکر دے کر آ رہا ہوں، یہ میرا حکم ہے۔" خان رحمان کی آواز غصے میں بھرگئی۔

"جی بہتر۔ اگر یہ آپ کا حکم ہے تو پھر ہم ضرور تعمیل کریں گے۔"

یہ کہہ کر فاروق بھی فرزانہ کو ساتھ لیے کمرے سے نکل گیا۔ ساروم کے دو ساتھیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، لیکن خان رحمان ان کے آڑے آگئے اور ان کی مدد سے وہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ برآمدے میں دوڑتے ہوئے فاروق نے ہانک لگائی:

"ہم آپ کا نیچے انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں، رکنے کی کوشش نہ کرو، ورنہ یہ لوگ ہمیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" خان رحمان نے بلند آواز میں کہا۔

فاروق اور فرزانہ جب پچھلے دروازے سے باہر نکلے تو محمود اور

پروفیسر داؤد ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے اور غالباً انہی کا انتظار کر رہے تھے۔

"چلے آؤ۔" محمود نے آواز نکالی۔ وہ بھی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"انکل نہیں آئے۔"

"انہوں نے رک کر ہمیں نکلنے کا موقع دیا ہے اور اب خود نکلنے کی کوشش میں ہوں گے، لیکن ان کا حکم یہ ہے کہ ہم ان کا انتظار نہ کریں۔"

"اس صورت میں ہم آپس میں کس طرح اکٹھے ہو سکیں گے۔" محمود نے الجھ کر کہا۔

"یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"تو پھر ٹھہرو، میں یہاں کوئی اشارا کرا دوں۔" یہ کہہ کر محمود نے جیب سے رومال نکالا اور اس پر پہاڑیوں کا نشان بنا کر ہوٹل کے دروازے کے قریب گرا دیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے بولا:

"سرحدی پہاڑیوں کی طرف چلیے۔"

"جی اچھا۔" اس نے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔

"ارے ہاں، وہ بات تو رہ ہی گئی۔ محمود ساردم کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے تم کس چیز سے خوف زدہ ہوئے تھے؟"

"دروازے پر سیاہ رنگ کا ایک بٹن نما آلہ چپکا دیکھ کر۔ وہ کوٹ کے بٹن جتنا بڑا تھا اور ایسا آلہ ہم پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ یہ آوازیں سننے کا آلہ تھا، گویا ساردم وہ آلہ چپکانے ہی اندر آیا تھا۔ اس کی آمد سے پہلے میں نے وہ آلہ وہاں نہیں دیکھا تھا، اس لیے میں خوف زدہ ہو گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہیں اس بٹن کے بارے میں بتا سکتا، اور ہم اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر سکتے، وہ اندر داخل ہو چکا تھا۔"

"اوہ، لیکن اب انکل....."

فرزانہ کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دوڑ گئے، پھر اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا:

"ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

☆☆☆

جھڑپ ہوگئی

"مسٹر عرفان غازی اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ اس کانپتے ہاتھ سے تم کیا پستول چلا سکو گے۔ میں جانتا ہوں، جملات کو تم نے ہی قتل کیا ہے اور ایسا تم نے اکبر بھورانی کے حکم سے کیا، کیوں ٹھیک ہے نا۔ اب مہربانی فرما کر یہ بتا دو کہ اکبر بھورانی کون ہے، کہاں رہتا ہے؟"

"مم، میں نہیں جانتا، تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو، ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

"تم گولی اس لیے نہیں چلا سکتے کہ مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر نہ جانتے تو ضرور اب تک گولی چلا دیتے، لیکن میرا خوف تم پر اس طرح سوار ہے کہ تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں، ورنہ ان ہی ہاتھوں سے تم نے جملات کا کام تمام کیا ہے اور وہ بھی سیڑھی کے ذریعے اس کی کھڑکی میں سے اندر داخل ہو کر۔ شاید جملات کی اس وقت آنکھ لگی ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اکبر بھورانی کا آدمی اس کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوگا مجھے تو حیرت تمہاری اس دیدہ دلیری پر ہے کہ اسے قتل کرنے کے بعد مجھے فون بھی کر ڈالا، آخر اس کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تم فون نہ کرتے تو کوئی تم پر شک تک نہ کر سکتا اور چند روز بعد تم قصبہ

جالوم آ جاتے۔ آخر تم نے مجھے فون کے ذریعے اس قتل کی اطلاع کیوں دی؟" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"میں نے تمہارا بہت نام سن رکھا تھا۔ جملات کو قتل کرنے کے لیے میں نے بہت انوکھی ترکیب کی تھی، لہٰذا میرا خیال تھا کہ تم چکرا کر رہ جاؤ گے اور اس قتل کا سراغ نہیں لگا سکو گے۔ بس میں تمہاری بے بسی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ تم قتل کا سراغ اتنی آسانی سے لگا لو گے۔"

"تمہارا منصوبہ واقعی بہت شاندار تھا، لیکن تم نے دو غلطیاں کیں۔ ایک تو غبارہ گلی میں پھینک دیا، دوسرے لوہے کے پائپ باورچی خانے میں چھپا دیے۔ تم اگر انہیں بھی کہیں دور پھینک آتے اور پھر مجھے فون کرتے تو شاید میں چکراتا ہی رہ جاتا۔ ہاں تو اکبر بھورانی کے بارے میں کیا کہتے ہو۔"

"اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

"نوردین موچی کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"اکبر بھورانی کے احکامات ہمیں نوردین موچی کے ذریعے ہی ملتے ہیں۔ جملات کے قتل کا حکم بھی مجھے اسی کے ذریعے سے ملا تھا، لیکن سب جانتے ہیں، نوردین موچی اکبر بھورانی ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"سب یہ بات کس طرح جانتے ہیں۔"

"ہاہاہا اجلاس....."

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت ایک فائر ہوا تھا۔ گولی عرفان غازی کی پیشانی میں لگی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور تڑپنے لگا۔ انسپکٹر جمشید نے ایک لوٹ لگائی، لیکن دوسرا فائر نہ ہوا، پھر وہ کمرے کے دروازے کی طرف دوڑے اور باہر نکل آئے۔ دوڑتے ہوئے بیرونی دروازے تک پہنچے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔

دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا، گویا وہ اب اس مکان میں مقتول کے ساتھ بند ہو چکے تھے۔ وہ واپس پلٹے اور عرفان غازی کے پاس آئے۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ گولی پیشانی کے عین درمیان میں نہیں لگی تھی، بلکہ ایک طرف سے ہو کر گزر گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس پر جھکے اور بولے:

"عرفان غازی جلدی بتاؤ، تم پر گولی کون چلا سکتا ہے۔ اکبر بھورانی کون ہے، کیا تم بتاؤ گے؟"

اس نے تکلیف دہ انداز میں ان کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

"نن نہیں۔ افسوس نہیں، میں نہیں جانتا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی گردن ڈھلک گئی اور جسم ساکت ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک نظر کمرے اور کمرے کی چیزوں پر ڈالی، پھر کچھ خیال آنے پر جھک کر عمران غازی کی تلاشی لی، لیکن جیبوں سے کوئی بھی کام کی چیز نہ مل سکی۔ اب انہوں نے پورے مکان کی تلاشی لی۔ اچانک انہیں یاد آیا۔ عرفان غازی کے منہ سے آخری الفاظ ماہانہ اجلاس نکلے تھے۔ اس کے ماہانہ اجلاس کہنے سے کیا مراد تھی، اس نے کہا تھا کہ سب لوگ یہ بات جانتے ہیں، نوردین موچی اکبر بھورانی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ماہانہ اجلاس..... اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ آخر وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ کیا ان لوگوں کا کوئی ماہانہ اجلاس بھی ہوتا ہے اور اس ماہانہ اجلاس میں اکبر بھورانی خود موجود ہوتا ہے، باقی سب ممبر اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں اور ان سب میں نوردین موچی بھی ہوتا ہے، اس لیے عرفان غازی یہ کہنا چاہتا تھا کہ نوردین موچی اکبر بھورانی نہیں ہو سکتا۔ ضرور یہی کہنا چاہتا تھا۔ اور اس کا مطلب ہے، ماہانہ اجلاس کے بارے میں نوردین موچی سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مجھے خود اس کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ ایک بار پھر بے خیالی میں صدر دروازے کی طرف بڑھے، لیکن انہیں خیال آیا کہ صدر دروازے تو قاتل بند کر گیا ہے۔ اب وہ مکان کی چھت پر پہنچے۔ عین اسی وقت انہوں نے پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں سنیں اور پھر کئی جیپیں رکنے کی آواز آئی۔ اب انہیں جلد از جلد اس مکان سے نکلنا تھا۔ انہوں نے منڈیر کا چاروں طرف سے جائزہ لیا، لیکن کسی طرف سے بھی نکلنے کا راستہ نظر نہ آیا۔ اسی وقت انہوں نے لاؤڈ سپیکر پر آواز سنی۔

"اس مکان کے اندر جو کوئی بھی ہے، دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے باہر نکل آئے، ورنہ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جائے گا۔" یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد خاموشی چھا گئی۔

وہ سوچنے لگے، اب کیا کریں۔ پولیس تو انہیں بطور قاتل گرفتار کرنے کا پروگرام بنا چکی تھی۔ قاتل نے رخصت ہوتے وقت ضرور پولیس کو اطلاع دی تھی کہ اس مکان میں ایک شخص کو قتل کر دیا گیا ہے اور قاتل ابھی تک اندر موجود ہے۔ آخر وہ دبے پاؤں نیچے اترے اور صدر دروازے کے بائیں طرف پائیں باغ میں گھس گئے۔ یہاں اونچے اونچے اور گھنے درخت موجود تھے، جو مکان کی چار دیواری سے اونچے چلے گئے تھے۔ انہوں نے پچھلے حصے کے ایک درخت کو پسند کیا اور اس پر چڑھ گئے۔ دوسری طرف لاؤڈ سپیکر پر بار بار دھمکی دی جا رہی تھی۔ انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اور دیوار پر اتر گئے۔ اسی وقت انہوں نے سنا:

"چلو، اندر داخل ہو جاؤ، جوں ہی وہ سامنے آئے، گولی مار دینا۔"

"جی بہتر۔"

دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور وہ ایک درخت پر چڑھ گئے، پھر مناسب فاصلے سے چھلانگ لگا دی۔ اس قسم کی چھلانگیں لگانا، ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

دوسری طرف زمین سخت تھی، ان کے گرنے سے آواز ابھری، کسی نے فوراً چلا کر کہا:

''شاید وہ پچھلی طرف کود گیا۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے دوڑ لگا دی اور گلیوں ہی گلیوں میں گھستے چلے گئے۔ وہ اپنے پیچھے بے شمار دوڑتے قدموں کی آواز سن رہے تھے، لیکن بھلا دوڑنے والے ان کی گرد کو کہاں پہنچ سکتے تھے، آخر قدموں کی آواز بہت پیچھے رہ گئی۔ اب جو انہیں ایک گلی میں مین روڈ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ سڑک پر آ گئے۔ دور دور تک کسی ٹیکسی کا نام و نشان نہ تھا، تاہم ایک کار آتی ضرور نظر آئی۔ انہوں نے ڈرائیور کو لفٹ کا اشارا دیا۔ کار پہلے تو کچھ آگے بڑھ گئی، پھر رک کر بیک ہونے لگی۔

''فرمایئے، کیا بات ہے؟''

''مجھے ہوٹل گلنار جانا ہے۔ یہاں نو وارد ہوں۔ دور دور تک کوئی ٹیکسی نہیں۔''

''ہوٹل گلنار یہاں سے کافی دور ہے اور میں اس طرف جا بھی نہیں رہا، تاہم میں آپ کو ایسی جگہ تک لے جا سکتا ہوں، جہاں سے ٹیکسی مل جائے۔''

''چلیے یہی سہی۔'' انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ہوٹل گلنار کے سامنے اترے۔ انہوں نے دیکھا، وہاں بھی ہر طرف پولیس ہی پولیس تھی۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں ہوشیار کر دیا۔ چکر کاٹ کر وہ پچھلے دروازے پر پہنچے۔ ان کی نظر ایک رومال پر پڑی، وہ چونک اٹھے، اس رومال کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ فوراً جھکے اور رومال اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور پھر اندر داخل ہوئے، اوپر پہنچے۔ اسی وقت انہوں نے ایک ایسا دردناک منظر دیکھا کہ ان کی روح تک لرز گئی۔ پندرہ سولہ پولیس والے مل کر خان رحمان کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے اور ان پر مکے برسا رہے تھے اور دو آدمی کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان

میں ایک تو لمبے قد کا آدمی تھا، دوسرا ایک پولیس افسر۔ ان کا خون کھول اٹھا۔ انہوں نے بلند آواز میں کہا:

''یہ کیا ظلم ہو رہا ہے؟''

خان رحمان کے کانوں تک ان کی آواز پہنچ گئی، لیکن اس وقت تک وہ بالکل بے دم ہو چکے تھے۔ انہوں نے بجھی بجھی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر دھڑام سے گر پڑے۔

''بے ہوش نہ ہونا خان رحمان، میں ان لوگوں سے اس زیادتی کا بدلہ لوں گا اور تم کھلی آنکھوں سے ان کی مرمت ہوتے دیکھو گے۔''

''کون ہو تم؟'' پولیس افسر نے بھنا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید نے منہ سے تو کوئی جواب نہ دیا، ایک لمبی چھلانگ لگائی اور عین اس کے قریب جا کر گرے۔ ساتھ ہی اس کی ٹھوڑی پر بھرپور مکا لگا۔ اب انہوں نے کہا:

''بے وقوف اور ظالم انسان، مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے چلنے لگے۔ پولیس والوں نے انہیں بھی گھیرے میں لے لیا اور ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہا جو خان رحمان کے ساتھ کرتے رہے تھے، لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ انہیں یوں لگا، جیسے کوئی بجلی کا بنا ہوا انسان ان پر تابڑ توڑ وار کر رہا ہے۔

''خان رحمان، تم ہوش میں تو ہو، سرک کر دیوار تک چلے جاؤ۔ اور تماشا دیکھو۔ میں جب تک ان سب کو ادھ موا نہ کر دوں، میرے ہاتھ نہیں رکیں گے۔''

ساتھ ہی انہوں نے محسوس کیا، لمبا آدمی زینے کی طرف کھسک رہا تھا۔ کانسٹیبلوں کے نرغے سے نکل کر انہوں نے اس کا بھی مزاج پوچھ ڈالا اور گرج کر

بولے:

"خبردار، تم میں سے کوئی زینے کا رخ بھی نہیں کرے گا، ورنہ پہلے اس کی شامت اسے آدبوچے گی۔"

کانسٹیبل تڑاتڑ گرنے لگے۔ خان رحمان سرک کر دیوار تک چلے گئے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے انہوں نے کانسٹیبلوں کو گرتے دیکھا اور پھر ان کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ کھیل گئی۔

اچانک پولیس افسر نے لیٹے لیٹے سیٹی بجانا شروع کر دی، گویا وہ اپنے اور ماتحتوں کو بلا رہا تھا۔

"جمشید، اب یہاں سے بھاگ چلو۔"

"نہیں دوست، میں ان کی چٹنی بنائے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"ان کے اور ساتھی اوپر پہنچنے والے ہیں۔ اتنے لوگوں سے تم تنہا ٹکر نہیں لے سکو گے۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس دوڑ میں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔"

"تو پھر اس کی آسان ترین ترکیب یہ ہے کہ زینہ بند کر دو۔ اس طرح کوئی اوپر نہیں آ سکے گا۔ ہاں جب یہ سب لوگ گر جائیں گے، اس وقت ہم ضرور یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

"اچھا۔" خان رحمان بولے، کیونکہ وہ جانتے تھے، انسپکٹر جمشید کے سر پر ضد سوار ہو چکی ہے اور اب انہیں کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھے اور پھر زینے کی طرف چل پڑے۔ جلد ہی انہوں نے بے شمار قدموں کی آواز سنی۔ وہ لوگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ وہ جلدی سے زینے تک پہنچے اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

ادھر انسپکٹر جمشید کے ہاتھ اسی تیزی سے چل رہے تھے، وہ کسی کا وار بازو پر روک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے ان کی ٹھوڑیوں پر مکوں کی بارش ہو رہی ہو۔

"اب بس کرو جمشید، وہ لوگ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کام میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"کوئی پروا نہیں، ہم جائیں گے ان لوگوں کے گرنے کے بعد ہی۔" وہ بولے۔

"لیکن جمشید، ہم کس طرح جائیں گے۔ زینے کا راستہ تو بند ہو چکا ہے۔"

"ہم چھت پر چڑھ جائیں گے۔ ہنگامی حالات کے لیے اوپر کوئی راستہ ضرور بنایا گیا ہوگا۔" انہوں نے کہا۔

"اُف جمشید، تم خطرے کو آواز دے رہے ہو۔ ضد سے باز آ جاؤ، ان لوگوں سے انتقام ہم پھر بھی لے سکتے ہیں۔" خان رحمان گھبرا گئے۔

"نہیں خان رحمان میرا خون کھول رہا ہے اور اس کا کھولاؤ اس وقت تک نہیں رکے گا، جب تک یہ سب لوگ فرش پر نہیں لیٹ جائیں گے۔" انہوں نے پختہ لہجے میں کہا اور خان رحمان خاموش رہ گئے۔ وہ ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اچانک انہوں نے کہا:

"دروازہ اب ٹوٹنے ہی والا ہے۔"

"اور یہ لوگ بھی گرنے ہی والے ہیں۔ صرف تین ہی تو رہ گئے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اور بھی تیزی سے ہاتھوں کو گردش دی۔ آن کی آن میں وہ تین بھی گر گئے۔ اب ان میں سے کوئی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ گیا تھا۔

"آؤ خان رحمان، اب چلیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور

چھت تک لے جانے والی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔ اسی وقت انہوں نے دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنی۔

چھت سے واقعی لوہے کی ایک سیڑھی نیچے تک جا رہی تھی۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جلدی جلدی نیچے اترنے لگے۔ جونہی انہوں نے آخری سیڑھی کو چھوا، چھت پر پولیس والے نظر آئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی بیسیوں سیٹیاں بجنے لگیں۔

''آؤ، جلدی کرو۔''

انسپکٹر جمشید گلی میں ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

اب انہیں بے شمار سمتوں سے سیٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ ہر آن یہ محسوس کر رہے تھے کہ انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

''جمشید، ہم نے سارے شہر کی پولیس کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ ادھر محمود، فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان حالات میں ہم کیا کریں گے۔''

''فکر نہ کرو، ان تک پہنچنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''وہ کیسے؟'' خان رحمان بولے۔

''وہ جاتے ہوئے اپنا ایک رومال گرا گئے ہیں اور اس رومال سے ہمیں ضرور اشارا ملے گا۔ ویسے تو میں اس رومال کے بغیر بھی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ کہاں گئے ہوں گے، لیکن بھئی پہلے یہ تو بتاؤ، ہوا کیا تھا؟''

''جمشید تم بھی عجیب ہو۔ چاروں طرف پولیس ہماری تلاش میں دوڑ رہی ہے اور تم یہ سننے کے موڈ میں ہو کہ ہوا کیا تھا۔ پہلے کسی طرح ان لوگوں سے نجات تو

حاصل کر لو۔''

''یہ کیا مشکل ہے، یہ دیکھو، میں اپنا میک اپ ختم کر رہا ہوں اور ایک نئی تبدیلی پیدا کر رہا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے نقلی مونچھیں اتار لیں اور جیب میں کوئی چیز نکال کر منہ میں ڈال لی۔ ساتھ ہی ان کا ایک گال قدرے ٹیڑھا ہو گیا۔ آن کی آن میں ان کے چہرے میں حیرت انگیز تبدیلی آ گئی۔ خان رحمان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا:

''ارے، کمال ہے۔''

''اب تم بھی یہی کرو۔ مونچھیں اتار کر جیب میں رکھ لو۔''

''لیکن میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جو تم نے منہ میں ڈالی ہے۔'' خان رحمان بوکھلا کر بولے۔

''فکر نہ کرو، وہ تمہیں میں دوں گا۔''

ایک منٹ بعد ان کے حلیے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔

''بس اب دوڑنے کی ضرورت نہیں۔ آؤ سڑک پر چلیں۔''

''سڑک پر، لیکن سڑک پر تو پولیس والے پوچھ گچھ کریں گے۔''

''نہیں کریں گے، آؤ۔'' وہ بولے اور گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ دور سے پولیس والے آتے دکھائی دیے۔ وہ انہی کی طرف بڑھنے لگے۔

''یہ کیا، تم تو خود ہی ان کی طرف جا رہے ہو۔''

''ہاں، یہی تو گُر ہے، ان سے بچنے کا۔ وہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔''

''اوہ۔''

اور ہوا بھی یہی۔ پولیس والے ان کے قریب سے گزر گئے۔ انہوں نے

ان کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

''کیوں کیسی ترکیب رہی؟''

''کمال کی۔ اس وقت تو تم نے فرزانہ کو بھی دو ہاتھ پیچھے چھوڑ دیا۔'' وہ مسکرائے۔

''اب ہمیں کوئی ٹیکسی پکڑ لینی چاہیے۔ اس کے بعد ہم اس رومال کو دیکھیں گے۔''

پانچ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد انہیں ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس میں بیٹھنے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

''وہ لوگ ضرور سرحدی پہاڑیوں کی طرف گئے ہوں گے۔ اب میں رومال نکالتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رومال نکال لیا، پھر اس پر بنی تصویر کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

''لو دیکھ لو، میرا خیال بالکل درست تھا۔''

خان رحمان نے رومال لے کر دیکھا اور پہاڑی کی شکل دیکھ حیرت میں رہ گئے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید بولے:

''لیکن ہم ابھی ان کی طرف نہیں جائیں گے۔ ڈرائیور صاحب، آپ کو نوردین موچی کی کوٹھی کے بارے میں معلوم ہے؟''

''جی ہاں، انہیں کون نہیں جانتا۔''

''تو پھر مہربانی فرما کر ہمیں وہاں لے چلیے۔''

''جی بہتر۔'' اس نے کہا اور ٹیکسی موڑ دی۔

کئی پولیس پارٹیاں ان کے قریب سے گزریں، کچھ جیپیں بھی گزریں لیکن چونکہ ان کی ٹیکسی نہایت پرسکون انداز سے اور آہستہ رفتار سے چل رہی تھی، اس

لیے کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں پولیس والے ان پر نظر ضرور ڈالتے رہے۔ آخر وہ نوردین موچی کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔

''آپ کو یہاں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ بس ہمیں ان سے چند باتیں کرنا ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جناب۔'' اس نے خوش اخلاق لہجے میں کہا۔

انسپکٹر جمشید اور خان رحمان نیچے اتر گئے اور گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

☆☆☆

دولت کے دروازے

انہوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ زرد رنگ کی ایک کار چلی آ رہی تھی۔

"اس میں پولیس کے آدمی تو نظر نہیں آتے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"نہیں، ہو سکتا ہے۔ اس کار میں اکبر بھورانی کے آدمی ہوں۔" محمود نے کہا۔

"اوہ، اس صورت میں انہیں غچہ دینا بہت ضروری ہے، ورنہ یہ ہمارے پیچھے پہاڑیوں تک پہنچ جائیں گے اور ہمارا پہاڑیوں کی طرف جانا بہت ضروری ہے، کیونکہ ابا جان اور انکل خان رحمان بھی ادھر کا ہی رخ کریں گے۔" فرزانہ بولی۔

"تو ٹھیک ہے، ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا کیا مشکل ہے، جب کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔" فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"مم، میرا مطلب ہے، تم ترکیب بتا دو۔ ہم اسی ترکیب پر عمل کر کے ان سے پیچھا چھڑا لیں گے۔"

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے۔" محمود مسکرایا

"بھئی جو کچھ کرنا ہے، ذرا جلدی کرو، زرد کار کافی نزدیک آ چکی ہے۔" پروفیسر داؤد گھبرا کر بولے۔

"ڈرائیور صاحب، ٹیکسی اچانک کسی سڑک پر موڑ کر روک دیجیے۔ یہ رہا آپ کا کرایہ" فرزانہ بولی، ساتھ ہی اس نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ اگلی سیٹ کی طرف بڑھا دیے۔

"شکریہ، ایک منٹ بعد آگے چل کر بائیں طرف ایک تنگ سڑک آنے والی ہے، میں اس پر موڑ دوں گا، آپ نیچے اتر کر دوڑ لگا دیجیے گا۔ سڑک اتنی تنگ ہے کہ دوسری کار نہیں گزر سکتی۔ میں ٹیکسی گلی سے نکالنے کے لیے بیک کرنا شروع کر دوں گا۔ اس طرح وہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"بھئی واہ، یہ ہوئی نا ترکیب، اس کے مقابلے میں فرزانہ کی ترکیب تو بالکل پھس پھسی رہی۔"

"تم تو یہ بھی نہ بتا سکے۔"

"میرا کام ہو تو بتاؤں بھی۔" اس نے کہا۔

"بس بس، شروع نہ ہو جانا۔ ابھی ہمیں پہاڑیوں تک بھی پہنچنا ہے۔"

"اور میں چکر کاٹ کر اس گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ جاؤں گا۔ آپ میرا انتظار کیجیے گا۔" ڈرائیور نے کہا۔

"واہ، آپ جیسے ڈرائیور بھی ہمیں بہت کم ہی ملے ہوں گے۔" محمود بولا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ہم پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟" اچانک فرزانہ بولی۔

"زرد کاریں صرف اکبر بھورانی کے آدمی استعمال کرتے ہیں اور میں اس شخص سے نفرت کرتا ہوں۔"

"لل، لیکن کیوں؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

"بتادوں گا ٹھہر کر۔ اس وقت تو آپ اترنے کے لیے تیار ہو جائیں، موڑ آرہا ہے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹیکسی مڑ گئی، پھر اسے زوردار بریک لگا۔ انہوں نے دروازے کھولے اور باہر نکل گئے۔ اب وہ گلی کے دوسرے سرے کی طرف دوڑ رہے تھے اور ٹیکسی گلی سے باہر نکلنے کے لیے الٹی جا رہی تھی۔ اسی وقت انہوں نے زرد کار کا زوردار ہارن سنا۔ غالباً زرد کار والے ٹیکسی والے پر بھنا رہے تھے۔

انہوں نے دوڑ لگا دی۔ ایک منٹ بعد ہی وہ سڑک پر تھے، لیکن کسی آن پیچھے سے زرد کار آنے والی تھی، لہٰذا انہوں نے سڑک کی بجائے ساتھ والی گلی میں کھڑے ہونا پسند کیا۔ آدھ منٹ بعد ہی زرد کار سڑک پر آئی اور رک گئی۔ انہوں نے دیکھا، اس میں چار غنڈے موجود تھے۔ غالباً وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کس طرف گئے ہیں، یہ دیکھ کر وہ گلی میں پیچھے ہٹنے لگے کہ کہیں ان کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ زرد کار والوں کو گلی کا خیال اس وقت آیا جب وہ بہت پیچھے ہٹ چکے تھے۔ اور ان کی نظروں میں نہیں آسکتے تھے۔ آخر جلد ہی انہوں نے کار روانہ ہونے کی آواز سنی۔

"آؤ، اب سڑک پر چلیں۔ کہیں ہمارا ٹیکسی ڈرائیور ہمیں غائب پا کر چلا نہ جائے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ابھی ٹھہریں انکل، ہو سکتا ہے، مجرموں میں سے ایک یا دو کار سے اتر گئے ہوں اور سڑک پر ہی موجود ہوں۔" فرزانہ نے کہا۔

تین منٹ تک ٹھہرنے کے بعد آخر انہوں نے سڑک کا رخ کیا۔ ٹیکسی سڑک کے کنارے موجود تھی۔

"آئیں بھئی، کہاں رہ گئے تھے؟" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"اسی گلی میں چھپے ہوئے تھے، کیونکہ وہ ہمیں دیکھنے کے لیے گلی کا رخ بھی کر سکتے تھے۔"

"وہ شہر کی طرف چلے گئے ہیں۔ اب ہم نہایت اطمینان سے پہاڑیوں کی طرف جا سکتے ہیں، بیٹھ جائیں۔"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ سفر پھر شروع ہو گیا۔ پانچ منٹ تک پچھلی طرف کا جائزہ لینے کے بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی کار ان کا تعاقب نہیں کر رہی۔

"ہاں تو ڈرائیور صاحب، اب بتایئے وہ بات۔ میرا مطلب ہے، آپ اکبر بھورانی سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

"اس لیے کہ میں سیٹھ تیمور ایاز کا بیٹا ہوں۔ ہمارا گھرانا اسی ظالم شخص کی وجہ سے غربت کا شکار ہوا ہے۔"

"اوہ" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆

نوردین موچی نے انہیں الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پہلے وہ تنہا آئے تھے اور اب میک اپ میں تھے، حلیے میں تبدیلی ہو چکی تھی اور خان رحمان بھی ان کے ساتھ تھے۔

"کیا بات ہے، تم لوگ کون ہو؟"

"یہ بات ہم اس وقت بتائیں گے، جب آپ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر لیں گے، بہت ہی خاص بات ہے۔" انسپکٹر جمشید رازدارانہ لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب؟" نوردین موچی چونکا۔

"مطلب بھی بعد میں بتائیں گے۔"

"تم لوگ آخر ہو کون؟" اس نے بھنا کر کہا۔

"عرفان غازی مارا جا چکا ہے، لیکن مرنے سے پہلے وہ ہمیں ایک بات بتا چکا ہے۔ بہتر ہوگا، دروازہ بند کر کے سُن لیں۔"

"کون عرفان غازی، میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"نہیں جانتے ہوں گے، لیکن اس آدمی کو ضرور جانتے ہیں۔ جو پاگل ہے اور اکثر آپ کی کوٹھی میں بھی گھس آتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو میرے سامنے اسے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔

"کیا؟" وہ بوکھلا اٹھا: "کیا تم انسپکٹر جمشید ہو؟"

"اوہو، تو کیا آپ کو میرے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ بہت تیز نظر ہے آپ کی، اور آپ کے آدمیوں کی۔ خیر، اگر آپ دروازہ بند نہیں کر سکتے تو نہ سہی، ہمیں یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ آپ اکبر بھورانی کے خاص آدمی ہیں اور....." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"اور کیا؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"اب دروازہ ہم خود بند کریں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے پستول نکال لیا اور خان رحمان سے بولے:

"دروازہ بند کر دو خان رحمان۔"

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"خان رحمان، ہوٹل میں جن پولیس والوں نے تم پر ظلم کیا، اس ظلم میں اس شخص کا بھی ہاتھ تھا۔ اسی کے حکم پر پولیس حرکت میں آئی تھی۔"

"اوہ۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"اگر تم اس سے ان زیادتیوں کا انتقام لو تو مجھے بہت خوشی ہوگی خان رحمان۔" وہ عجیب سے انداز میں بولے۔

"تم لوگ اپنی موت کو آواز دے رہے ہو۔" نور دین موچی غرایا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ یہ ہماری پرانی عادت ہے۔ خان رحمان، تم حرکت میں نہیں آئے۔ اگر کمزوری محسوس کر رہے ہو تو یہ پستول تم تھام لو، تمہارے حصے کا کام میں کیے دیتا ہوں۔"

"ہاں جمشید، میری حالت اچھی نہیں ہے، جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔"

"تو پھر یہ پستول پکڑ لو اور دیکھتے رہو، میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے پستول ان کی طرف بڑھا دیا۔ اسی وقت ایک فائر ہوا اور خان رحمان کے ہاتھ سے پستول نکل گیا۔ پستول پکڑنے کے چکر میں ان سے کوتاہی ہو گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا، موقعے سے فائدہ اٹھا کر نور دین بھی پستول نکال چکا تھا۔

"اب کیا خیال ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا

"وہی جو پہلے تھا۔ تمہاری مرمت ضرور ہوگی، ورنہ تم زبان کس طرح کھولو گے۔"

"تو تم میری زبان کھلوانے آئے ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اکبر بھورانی کا ماہانہ اجلاس کس جگہ ہوتا ہے۔"

"بہت خوب، تو عرفان غازی تمہیں مرنے سے پہلے یہ بات بتا چکا ہے کہ ہمارا ماہانہ اجلاس بھی ہوتا ہے۔ خیر، تم یہ راز دوسروں کو بتانے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔ انسپکٹر جمشید نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی۔ خان رحمان فرش پر لڑھک گئے۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کے پاؤں کی

ٹھوکر نوردین موچی کی پنڈلی پر لگی۔ درد کی شدت نے اسے پستول چھوڑ کر پنڈلی پکڑنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے فوراً پستول اٹھا لیا۔

''لو خان رحمان، اب اس کا پستول سنبھال لو۔ میں مرمت کا کام شروع کرتا ہوں۔''

''لیکن اب پستول سنبھالنے کی کیا ضرورت۔ اس کے پاس اب پستول نہیں ہے۔'' خان رحمان بولے۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے، پھر بھی تم پستول اپنے قبضے میں تو لے ہی لو۔''

پستول انہیں دے کر انسپکٹر جمشید اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے:

''ہاں تو اجلاس کہاں ہوتا ہے؟''

''نہیں بتا سکتا۔''

''تو تم اکبر بھورانی کے ساتھی ہو؟''

''ہاں، ساتھی ہوں اور تم بہت جلد اپنی موت کو گلے لگا لو گے۔''

''ہمارے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بتا دو کہ اجلاس کہاں ہوتا ہے۔''

''نہیں بتاؤں گا۔''

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی ٹھوڑی پر ایک زبردست مکا لگا۔ وہ دوسری طرف الٹ گیا اور اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ خون تھوکتے ہوئے اس نے کہا:

''تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔''

''اجلاس کہاں ہوتا ہے؟'' انہوں نے اس کا جملہ جیسے سنا ہی نہیں، اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

''اجلاس وقار منزل میں ہوتا ہے۔ یہ قصبے کے شمالی سرے پر ایک بہت بڑی عمارت ہے۔'' آخر اس نے بتا دیا۔

''اور یہ عمارت کس کی ہے؟''

''وقار خان کی۔ یہ بھی اکبر بھورانی کی جماعت کا آدمی ہے۔''

''تو اکبر بھورانی کی باقاعدہ جماعت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔

''اٹھو، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ ہم دائیں بائیں پستول لیے تمہارے ساتھ ساتھ چلیں گے اور اسی حالت میں تمہاری کار میں بیٹھ جائیں گے۔ کار میں چلاؤں گا۔ اگر تم نے چوں بھی کی تو اسی وقت ڈھیر کر دیے جاؤ گے۔'' انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے۔

''جمشید تم نے اس سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ اکبر بھورانی کون ہے۔''

''کیوں نوردین صاحب، بتا سکتے ہیں، اکبر بھورانی کون ہے؟''

''آج تک یہ بات کوئی نہیں جان سکا۔'' اس نے کہا۔

''تم اس کے ساتھی کس طرح بن گئے تھے؟''

''رقم ملنے کے بعد اس کی ہدایت ملی تھی۔ یہ کہ اگر میں نے اس کا ساتھ دیا تو اس سے کئی گنا زیادہ دولت میں کھیلوں گا۔ میں نے بھلا اتنی دولت کہاں دیکھی تھی، لہٰذا اس کا ساتھی بن گیا اور پھر واقعی دولت کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔''

''تو اس طرح اس نے اپنے ساتھی پیدا کیے ہیں۔''

''ہاں۔''

''تم لوگوں کو احکامات کس طرح ملتے ہیں؟''

"بذریعہ فون، ہم نہیں جانتے، اس کا فون نمبر کیا ہے، وہ کہاں سے فون کرتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اس نے اپنے گھر میں کوئی ایسا فون لگوا رکھا ہے، جس کے نمبر ڈائریکٹری میں نہیں ہیں یا پھر وہ پبلک فون بوتھوں سے فون کرتا ہے۔ فون کے ذریعے بھی آج تک کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکا۔" اس نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے، وہ شخص کوئی بہت بڑا منصوبہ ساز ہے۔ اس نے آج سے پچیس سال پہلے اس منصوبے کی ابتدا کی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ بڑی کامیابی سے اپنے منصوبے پر عمل کرتا رہا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس کے خلاف قصبے سے باہر بھی آج تک کسی نے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کا خوف ہی اس درجے چھایا ہوا ہے، لیکن اب شاید اس کا بُرا وقت آ گیا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ اس نے عرفان غازی کو جملات کے خاتمہ پر لگا دیا۔ اسے اس کے تعاقب میں دارالحکومت جانا پڑا۔ عرفان غازی ایک شیخی خورہ آدمی تھا۔ اس نے جملات کو ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت قتل کیا اور پھر یہ دیکھنے کے لیئے کہ میں قاتل کا سراغ لگا سکتا ہوں یا نہیں مجھے فون کر ڈالا اور اس طرح ہم یہاں تک آ سکے۔ متعلقہ پولیس انسپکٹر قصبہ جالوم کا رہنے والا تھا اور آج سے بیس بائیس سال پہلے دارالحکومت چلا گیا تھا، تاہم اسے اکبر بھورانی کے بارے میں معلوم تھا، اسی سے ہمیں معلوم ہوا۔ اگر وہ نہ ملتا، تب بھی ہم قتل کا سراغ لگاتے اور جملات کے عزیزوں کی تلاش میں یہاں تک ضرور پہنچتے۔ یہاں پہنچتے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ میں نے یہاں آنے کا اعلان عرفان غازی کے سامنے ہی کر دیا تھا۔ عرفان غازی نے تمہیں فون کر دیا اور تم نے اپنے آدمیوں کو چوکس کر دیا۔ اکبر بھورانی کو بھی اطلاع دے دی گئی۔ ویسے تم اسے اطلاع کس طرح دیتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر پوچھا۔

"وہ خود ہی فون کرتا رہتا ہے۔"

"گویا اس نے یہ سب کچھ اس قصبے کا حکمران بننے کے لیے کیا ہے۔ اور عملاً وہ اس وقت قصبے کا حکمران ہی ہے، کیونکہ حکم اسی کا چلتا ہے۔ دارالحکومت سے کوئی حکم آئے تو بھی اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ سب لوگ اکبر بھورانی سے خوف کھاتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے مخالفین کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو اس کا حکم نہیں مانتے۔ ٹھیک ہے، اب ہم تمہیں ساتھ لے کر وقار منزل جائیں گے اور دیکھیں گے، اکبر بھورانی دراصل کون ہے۔ ارے ہاں، یہ تو ہم بھول ہی گئے، ماہانہ اجلاس کس تاریخ کو ہوتا ہے؟"

"ہر ماہ کی آخری تاریخ کو۔" اس نے کہا۔

"اور اتفاق سے مہینے کی آخری تاریخ دو دن بعد آنے والی ہے۔ بھئی واہ، اب یہ بھی بتا دو کہ کس وقت ہوتا ہے؟"

"اجلاس رات کے دس بجے شروع ہوتا ہے۔ اگر میں وہاں نہ پہنچا تو سب لوگ ہوشیار ہو جائیں گے اور اجلاس ملتوی کر دیں گے۔" اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"فکر نہ کرو، تم وہاں ضرور پہنچو گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"گویا تم مجھے ساتھ لے کر وہاں جاؤ گے؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہوگی۔ آؤ اب چلیں۔"

وہ باہر نکلے۔ نوردین کی کار تیار کھڑی تھی۔ یہ زرد رنگ کی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

پہاڑیوں کے نزدیک پہنچتے ہی انہوں نے کار ایک طرف روک دی اور پیدل آگے بڑھے۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا، لیکن محمود وغیرہ کہیں نظر نہ آئے۔ ظاہر ہے، وہ چھپے ہوئے تھے۔ اچانک ان کے منہ سے الو کی آواز نکلی۔ جواب

میں انہیں بھی الو کی آواز سنائی دی اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ نوردین موچی حیرت زدہ نظر آنے لگا۔ اس نے کہا:

''یہ کیسی آوازیں تھیں؟''

''الوؤں کی۔ بعض اوقات ہم میں الوؤں کی روحیں حلول کر جاتی ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''بھئی واہ جمشید، فاروق کی جگہ لینے کی کوشش کر رہے ہو شاید۔'' خان رحمان چہکے۔ اسی وقت محمود کی آواز سنائی دی:

''ابا جان، ہم یہاں ہیں۔'' ساتھ ہی وہ سامنے آ گئے۔

''شکر ہے، تم لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔ اب ذرا بیٹھ کر ایک دوسرے سے حالات سن لیں۔''

''لیکن یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟'' فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

''ایک قیدی، ان کا نام نوردین موچی ہے۔''

''اوہ۔'' ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ اب انہوں نے ایک دوسرے کو حالات سنائے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

''گویا ہم پورے قصبے کو اپنا دشمن بنا چکے ہیں، کیونکہ پورے قصبے میں اکبر بھورانی کا حکم چلتا ہے۔''

''خیر، کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ اکبر بھورانی کے ساتھی وقار منزل میں جمع ہوتے ہیں۔'' فاروق نے کہا۔

عین اسی وقت عجیب و غریب قسم کی آوازیں ان کے کانوں میں آنے لگیں۔ وہ حیران ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کافی دیر بعد انہوں نے دیکھا، بیسیوں جیپیں پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں، پھر گھوڑوں پر سیکڑوں

پولیس والے آتے دکھائی دیے۔

''اف خدا، یہ کیا؟'' فرزانہ کانپ کر بولی۔

''حملہ ان لوگوں کا ارادہ ہم پر حملہ کرنے کا ہے۔ یہ ہمیں گرفتار کرنے آئے ہیں اور ایسا کرنے کا حکم اکبر بھورانی نے دیا ہے۔''

''اب، اب کیا ہوگا؟''

''وہی، جو خدا کو منظور ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے، پھر انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک تھیلی نما چیز نکالی اور خان رحمان کو دیتے ہوئے بولے:

''خان رحمان، یہ لو، اور جب میں کہوں، اسے پوری طاقت سے اوپر اچھال دینا۔ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اونچائی پر جائے۔''

''لیکن یہ ہے کیا؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے پستول نکال لیا اور بولے:

''ہاں خان رحمان، اب اسے اچھال دو۔''

''لیکن تم تو اس کے بارے میں بتانے چلے تھے کہ یہ ہے کیا۔''

''ابھی دیکھ لو گے۔'' وہ بولے۔ خان رحمان نے تھیلی آسمان کی طرف اچھال دی۔

تھیلی کافی بلندی پر گئی اور پھر جوں ہی نیچے آنے لگی، انسپکٹر جمشید کے پستول سے ایک فائر ہوا۔ گولی ٹھیک تھیلی کو لگی، فوراً ہی ایک دھماکا ہوا اور چکا چوند روشنی نے پوری پہاڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند لمحوں کے لیے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندھے ہو گئے ہوں۔ آخر ایک منٹ بعد وہ دیکھنے کے قابل ہو سکے۔

"اف جمشید، یہ کیا تھا؟" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اشارا۔ میں جانتا تھا، پورے قصبے کی پولیس اور اکبر بھورانی کے تمام ساتھی ہمارے مقابلے میں آجائیں گے اور ہماری تکا بوٹی کر دینا چاہیں گے۔ اس لیے میں بھی انتظام کر کے چلا تھا۔ سرحد پر موجود فوج کا زیادہ تر حصہ اس وقت قصبے میں موجود ہے اور یہ جھما کا دیکھنے کے بعد وہ ادھر کا رخ کر چکی ہوگی۔ ان لوگوں کو صرف ہم سے ہی نہیں، ہمارے ملک کی فوج سے بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ ان کی مرضی ہے، مقابلہ کرتے ہیں یا ہتھیار ڈالتے ہیں۔"

"لیکن جمشید، فوجیوں کو پہنچنے میں تو بہت دیر لگ جائے گی، جب کہ یہ لوگ ہمارے بہت قریب آچکے ہیں۔"

"اتنی دیر نہیں لگے گی۔ میں انہیں پہلے ہی ہدایات دے چکا ہوں کہ ہم ضرورت پڑنے پر پناہ پہاڑیوں میں لیں گے، لہٰذا وہ آس پاس ہی موجود ہوں گے۔"

"ویری گڈ، پھر تو مزا آجائے گا۔" محمود خوش ہو کر بولا۔

"اب اتنے مزے میں بھی نہ آؤ۔ دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"خیر تو ہے، بہت دنوں بعد جلی بھنی نظر آرہی ہو۔" فاروق چہکا۔

"خبردار، تم لوگ ہاتھ اوپر اٹھا کر نیچے اتر آؤ، ورنہ ہم فائر کھول دیں گے۔ تم لوگوں کو تین اطراف سے گھیر لیا گیا ہے۔ فرار کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں، صرف چوتھا راستہ باقی ہے اور وہ دشمن ملک میں لے جاتا ہے۔ یوں بھی دوسری طرف عمودی پہاڑیاں ہیں اور ان پہاڑیوں سے گر کر ہلاک تو ہوا جا سکتا ہے، اترا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا تم لوگوں کی بہتری اسی میں ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔" نیچے سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کہا گیا۔

"اگر تم لوگ ہمارے ملک کے قانون کے پابند ہوتے تو ہم ضرور خود کو تمہارے حوالے کر دیتے اور عدالت سے انصاف چاہتے، لیکن ہم جانتے ہیں، تم لوگ ایک مجرم کے آلۂ کار بن کر رہ گئے ہو۔ صرف اسی کا حکم مانتے ہو، اس قصبے پر اسی کی حکمرانی ہے۔ ان حالات میں ہم خود کو تمہارے حوالے ہرگز نہیں کریں گے۔ دوسری طرف تم لوگوں کو یہ بات بھی جان لینی چاہیے، ہم تنہا نہیں ہیں، سرحدوں سے پوری فوج لے کر آئے ہیں اور وہ فوج عنقریب تمہارے پیچھے پہنچنے والی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو مڑ کر دیکھ لو، فوج کی آمد کے آثار نظر آجائیں گے۔ پچیس سال کے دوران یہ پہلا موقع ہے کہ فوج نے شہری معاملات میں دخل اندازی کی ہے۔ اس وقت تک فوج بالکل بے خبر رہی ہے کہ یہاں کیا کچھ ہوتا رہا ہے، لیکن اب فوج کو حالات سے باخبر کر دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے پیچھے دیکھ لو۔"

کانسٹیبلوں نے بوکھلا کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کافی فاصلے پر انہیں فوج کے آثار نظر آگئے۔ لیکن فاصلہ اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر ادھر سے نکل سکتے۔

"اور یہ بھی سن لو کہ ہم بھی تمہارے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

"اور کیا، اب اگر تم لوگوں کو ٹیڑھی کھیر کا شوق ہو تو آگے بڑھو اور تجربہ کر لو۔" فاروق نے چہک کر کہا۔

"خان رحمان، اپنی فوج کو منظم کر لو۔ پتھر یہاں ہر طرف بے شمار ہیں۔ ذخیرہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم ہیں بھی اونچائی پر۔ ان لوگوں کو نہایت آسانی سے شکار کیا جا سکے گا۔"

"تم فکر نہ کرو جمشید، یہ لوگ اب بچ نہیں سکیں گے یا تو یہ ہتھیار ڈال لیں گے یا پھر مارے جائیں گے، لیکن ذاتی طور پر میں یہی پسند کروں گا کہ یہ ہتھیار ڈال دیں۔"

آخر یہ ہمارے ملک کے باشندے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک غلط آدمی کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' خان رحمان بولے۔

''تم لوگ دیکھ چکے ہو کہ فوج تمہیں گھیرے میں لے چکی ہے۔ اب کیا ارادے ہیں۔ بہتر تو یہی ہوگا کہ ہتھیار ڈال دو۔ بصورت دیگر دو طرفہ وار سہنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''ہمیں سوچنے کی مہلت دی جائے۔'' لاؤڈ سپیکر پر کہا گیا۔

''ٹھیک ہے، تمہیں تین منٹ دیے جاتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

دونوں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔

''ابا جان، فوج کو کس طرح پتا چلے گا کہ انہیں تین منٹ کی مہلت دی گئی ہے؟'' فرزانہ نے سوال کیا۔

''میں جب تک فائر نہیں کروں گا، فوج اس وقت تک ان پر حملہ نہیں کرے گی۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔''

''کمال ہے ابا جان، آپ تو بہت پختہ انتظامات کر چکے ہیں۔''

''ایسے معاملات میں پختہ انتظامات نہ کرنے کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔'' انہوں نے کہا۔ اسی وقت لاؤڈ سپیکر پر آواز ابھری:

''ہم آپ لوگوں کی گرفتاری کا فیصلہ واپس لیتے ہیں۔ فوج سے درخواست ہے، ہمیں واپس جانے کا راستہ دیا جائے۔''

''ٹھہرو، سوچنے دو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔ پھر ان کی طرف مڑے:

''ہاں بھئی خان رحمان، یہ وہ مقام ہے، جب میں صرف اور صرف تم سے

مشورہ کر سکتا ہوں۔ اب کیا کیا جائے؟''

''ہم لوگوں کا مقصد اپنے ملک کی پولیس سے لڑنا جھگڑنا نہیں ہے۔ ہم تو دراصل اکبر بھورانی کو ختم کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اس قصبے میں بھی ہمارے ملک کا ہی قانون چلے، نہ کہ ایک شخص کی حکمرانی ہو، لہٰذا یہ ایک بہترین صورت ہے، ان لوگوں کو واپس جانے دیا جائے۔''

''خوب غور کرو۔ کہیں نتیجہ الٹا نہ نکلے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''بھلا نتیجہ الٹ کس طرح نکلے گا۔ ان لوگوں کے واپس جانے کے بعد ہم وقار منزل پہنچ جائیں گے اور اکبر بھورانی کو گرفتار کر لیں گے۔'' خان رحمان نے کہا۔

''ہوں، ٹھیک ہے۔ ان حالات میں اس کے سوا کچھ کیا بھی تو نہیں جا سکتا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ واپس جا سکتے ہو، لیکن اب تم لوگ اکبر بھورانی کا حکم نہیں مانو گے۔ ہم اس کا کانٹا نکال دیں گے، اور قصبے کے چوراہے پر اسے عوام کے سامنے پیش کریں گے، تاکہ اس کا خوف سب لوگوں کے دلوں سے نکل جائے۔''

''ٹھیک ہے، اس صورت میں بھلا ہم کیوں اس کے احکامات ماننے لگے، تو پھر فوج کو اشارا دیں۔''

''ہاں ضرور۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے تین بار حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی اور پھر بولے:

''اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ فوج آپ کا راستہ نہیں روکے گی۔''

''شکریہ، ہم جا رہے ہیں۔'' ان کی طرف سے کہا گیا اور پھر کانسٹیبل واپس مڑتے نظر آئے۔

''اُف خدا، حد تو۔ تو کیا، اکبر بھورانی کی حکمرانی ختم ہو رہی ہے؟''

نوردین موچی نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ان لوگوں کو حکومت کا حق نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی طرح برسر حکومت آ بھی جائیں تو انہیں نہایت ذلت کے ساتھ واپس جانا پڑتا ہے یا موت کو گلے لگانا پڑتا ہے۔" خان رحمان بولے۔

واپسی کا عمل شروع ہوا۔ فوج نے ان لوگوں کو راستہ دے دیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد میدان صاف تھا اور کانشیبل نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اب وہ لوگ بھی نیچے اترے اور فوج کے پاس آئے۔

"میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں۔ اب آپ لوگ واپس جا سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت بہتر۔" ان کے کیپٹن نے کہا۔

"اب ہمیں وقار منزل پہنچنا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"آپ کا کیا نام ہے کیپٹن؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"جی مجھے کیپٹن ارشاد کہتے ہیں۔"

"شکریہ کیپٹن، آپ نے اپنا فرض بہت خوبی سے ادا کیا۔"

"میرا تو خیال تھا کہ ایک مختصر سی جنگ لڑنا پڑے گی۔" کیپٹن ارشاد بولا۔

"اس کی نوبت بھی آ سکتی تھی، لیکن شاید کانشیبلوں کو عقل آ گئی۔" وہ مسکرائے۔

وہ نیچے اترنے لگے۔ کیپٹن ارشاد اپنے دستے کو لے کر سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ لوگ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ لوگ پیدل چلتے نوردین موچی کی کار تک پہنچے۔

عین اسی وقت فرزانہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس دوڑ گیا۔

☆☆☆

مقابلے کی گھڑی

"خیر تو ہے فرزانہ، یہ تم یکا یک خوف زدہ کیوں ہو گئیں۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ ہمیشہ یکا یک ہی خوف زدہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ آہستہ آہستہ ہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے سینکڑوں آدمی ہماری طرف بڑھ رہے ہوں۔" فرزانہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"لیجیے، اور سنیے۔ سینکڑوں آدمی بھلا یہاں کہاں سے آ گئے۔ تین سو کے قریب پولیس والے ضرور آئے تھے، جو واپس جا چکے ہیں، ہاں اگر وہ کسی شرارت کے موڈ میں ہیں تو ان کے واپس آنے کی ضرور امید کی جا سکتی ہے۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے فرزانہ کا خیال درست ہو۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"لیجیے انکل، آپ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔" فاروق بولا۔

"اتفاق سے میرے کان ایسی آوازیں سننے کے ماہر ہیں۔ فرزانہ کا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ آنے والے ہزاروں ہیں۔"

"تو کیا اکبر بھورانی سارے قصبے کو ہمارے مقابلے پر لے آیا ہے۔"

"نہیں، آنے والے شہری نہیں۔ ان کے قدم بہت نظم اور ضبط کے ساتھ زمین پر پڑ رہے ہیں۔ وہ ایک باقاعدہ فوج ہے۔"

"کیا کہا باقاعدہ فوج، لیکن باقاعدہ فوج تو ہمارے ساتھ ہے۔ یہاں کوئی اور باقاعدہ فوج کہاں سے آ گئی۔" انسپکٹر جمشید فکر مندانہ لہجے میں بولے۔

"آپ کا لہجہ ہمیں ڈرائے دے رہا ہے۔" فاروق نے پریشان ہو کر کہا۔

"خان رحمان، مقابلے کی گھڑی آ پہنچی، تیار ہو جاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں، میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں، لیکن ہماری تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ آنے والے سینکڑوں ہیں اور ہم چند۔" خان رحمان کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"لیکن ہم مقابلہ کرنے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہم پسپا بھی تو نہیں ہو سکتے۔ ہم تین طرف سے دشمن کے گھیرے میں ہیں اور ہماری کمر کی طرف پہاڑ ہیں۔ یہ پہاڑ دوسری طرف سے عمودی ہیں۔ یوں بھی دوسری طرف دشمن ملک ہے۔"

"میں اب تک حیران ہوں، ہمارے مقابلے پر فوج کہاں سے آ گئی۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"اگرچہ میں اندازہ لگا چکا ہوں، لیکن بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں آپ لوگ خوف زدہ نہ ہو جائیں اور ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ میدانِ جنگ میں دراصل ہمت

سب سے اہم چیز ہے۔ لڑنے والوں نے حوصلہ ہارا نہیں اور شکست کھائی نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ بتا دیجیے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، حوصلہ نہیں ہاریں گے۔" فاروق نے ایسے میں بھی مسکرا کر کہا۔

"خوب، مجھے تم پر فخر ہے۔ میرا خیال ہے، آنے والی فوج دشمن ملک کی فوج ہے۔"

"کیا؟" وہ سب ایک ساتھ چلائے۔ ان کے چہروں پر خوف دوڑ گیا۔

عین اسی وقت نقارے کی دھمک انہوں نے اپنے دلوں پر محسوس کی۔ آنے والی فوج باقاعدہ نقارہ بجا رہی تھی۔

"وہ لوگ قریب آ گئے ہیں۔ چند لمحوں میں نظر آ جائیں گے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"ہم مشکل میں گھر گئے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس معاملے میں غیر ملکی فوج بھی دخل دے سکتی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ عملی طور پر ہمارے ملک کا یہ قصبہ دشمن ملک کے قبضے میں ہے، لیکن کسی کو یہ بات معلوم نہیں۔ شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اکبر بھورانی دراصل دشمن ملک کا ایجنٹ ہے اور اس نے پچیس سال پہلے یہ چکر اپنے ملک کے اشارے پر چلایا تھا۔ اف خدا، فوج کے اس طرف سے......"

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت ایک ہوائی فائر ہوا تھا۔ پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

ان سب کے رخ قصبے کی طرف پھر گئے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہوں نے دیکھا۔ دشمن ملک کے سینکڑوں فوجی ان کی طرف بڑے طمطراق سے چلے آ رہے

تھے، اتنی شان و شوکت سے جتنی کہ کوئی فوج آ سکتی تھی۔ اس پیادہ فوج کے ساتھ ہر قسم کا سامان جنگ موجود تھا، گویا وہ پوری پہاڑیوں کو جہنم کا نمونہ بنا سکتے تھے۔

پھر کیا ہوا؟

یہ جاننے کے لیے "بھورانی کے مجرم" کا دوسرا حصہ "اونچی مہم" پڑھیے......

☆☆☆

D-83 سائٹ۔ کراچی
فون: 2578273 - 2584720
e-mail: atlantis@cyber.net.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے
اونچی مہم
اشتیاق احمد
اٹلانٹس پبلکیشنز

السلام علیکم!

آئیے، اس بار بالکل خشک باتیں کریں۔ تھوڑا سا گھی لے کر انہیں تر کر لیجیے گا، کیونکہ کبھی کبھی خشک باتیں بھی معدے کے لیے مفید ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں معدے کی فاتی رطوبت کو خشک کر دیتی ہیں۔ اب آپ یہ نہ کہہ بیٹھیے گا، یہ حکمت کا پیریڈ تو نہیں، یہ تو دو باتیں کا موقع ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، آپ تو جانتے ہی ہیں، میں موقع محل دیکھنے کا عادی نہیں، نہ ہی آپ کے محبوب کردار دیکھتے ہیں۔ بس حالات کی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ حالات کی بھٹی انہیں تپا کر کندن بنا دے۔ ذرا دیکھیے تو حالات اس مرتبہ ان کے لیے کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ ارے ہاں، یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اونچی جم، بھورانی کے مجرم کا دوسرا حصہ ہے۔ کہیں پہلے اسے نہ پڑھنا شروع کر دیجیے گا۔ اوہو، یہ کیا بات ہوئی، میں تو چلا تھا خشک باتیں کرنے، وہ تو رہ ہی گئیں اور ادھر صفحے کا پیٹ تقریباً بھر گیا۔ خیر، خشک باتیں آئندہ پر ادھار رکھیے، اس بار تر باتوں سے ہی کام چلا لیں۔ خشک باتوں کا کیا ہے، وہ تو میں کرتا ہی رہتا ہوں، شکریہ!

اشتیاق احمد

بوڑھا انسان

چند لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں کھڑے انہیں دیکھتے رہے، پھر انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری:

"خان رحمان، تمہاری زندگی میں جنگ و جدل کے مواقع پہلے بھی نہ جانے کتنی مرتبہ آ چکے ہوں گے۔ اس موقعے کے متعلق کیا خیال ہے، کیا ہم اس فوج کا مقابلہ کر سکیں گے، جب کہ ہم تعداد میں بالکل کم ہیں، ساز و سامان بھی پاس نہیں، صرف ایک پستول ہے یا پتھر، پھر تین طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور کمر کی طرف فرار کا راستہ بھی نہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟"

"جہاں تک مقابلے کا تعلق ہے، ہم کر سکتے ہیں، لیکن فتح کی امید نہیں رکھ سکتے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ہم شکست کھا جائیں گے اور شہادت کے جام نوش کر لیں گے، کیونکہ فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ان سے بات چیت کر کے معلوم کریں، یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟" خان رحمان کی بجائے پروفیسر داؤد بول اٹھے۔

"شکریہ پروفیسر صاحب۔ خان رحمان، تم کیا کہتے ہو؟"

"وہی، جو میں ایسے موقعوں پر کہا کرتا ہوں۔ ہم مسلمان ہیں، ہر وقت موت کو خوش آمدید کہنے والے ہیں۔ موت کا کیا ہے، کسی وقت بھی آ سکتی ہے اور

شہادت کی موت کا تو کہنا ہی کیا، پھر ڈرنا کیسا؟ کیوں نہ ہم ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جانیں دے دیں۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن اگر جانیں بچانے کا امکان ہو تو حکم یہ ہے کہ جانیں بچائی جائیں، لہٰذا پہلے میں ان لوگوں سے بات کروں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

چند منٹ بعد دشمن فوج اس حد تک نزدیک آ گئی کہ بات چیت کا دروازہ کھولا جا سکتا تھا، چنانچہ انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے:

"ہمارے ملک میں تم لوگوں کی آمد قانون کے خلاف ہے۔ وضاحت کرو، تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم سب کو گرفتار کرنا اور گرفتار کر کے اپنے ملک لے جانا۔ وہاں ہم تمہیں اپنا قیدی بنا کر رکھیں گے۔" دشمن کی طرف سے انگریزی میں جواب ملا۔

"کیا تم اس کا نتیجہ جانتے ہو، دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ سکتی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے گویا دھمکی دی۔ اس بار وہ بھی انگریزی میں بولے تھے۔

"اس کا امکان نہیں۔ اول تو تمہارا ملک کمزور ہے، چھوٹا ہے، بڑی طاقت سے ٹکر لینا تمہارے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر تم لوگ ملک کے لیے اس قدر اہم ہو بھی کہ تمہارا ملک تمہاری خاطر جنگ چھیڑ دے گا تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ تمہارے ملک کے لوگوں کو تو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو گی کہ تم لوگ کہاں ہو۔ تمہاری تلاش ملک بھر میں ہوتی رہے گی اور تم ہماری قید میں ہو گے۔ کیوں، کیسی رہی؟"

"آخر تم ہمیں قیدی کیوں بنانا چاہتے ہو؟" خان رحمان جھنجلا اٹھے۔

"اس لیے کہ تم اکبر بھورانی کا راز جان گئے ہو۔ تم نے یہ بات محسوس کر لی ہے کہ اکبر بھورانی دراصل ہمارے ملک کا ایجنٹ ہے اور عملی طور پر اس قصبے میں ہماری حکومت ہے۔ ہمارا حکم چلتا ہے۔ اکبر بھورانی ہمارے اشاروں پر ناچتا ہے، لیکن ہم نہیں چاہتے، یہ راز تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی معلوم ہو، لہٰذا یہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے ملک لے جائیں۔"

"اور اگر ہم جانے سے انکار کر دیں تو؟" محمود نے چلا کر کہا۔

"تمہارے انکار کی بھلا کیا حیثیت ہے۔ تم ہمارے سامنے بالکل بے بس ہو۔ مقابلے کی صورت میں بھی یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے یا گرفتار ہو جاؤ گے۔ بہتر ہے، مقابلے کے بغیر ہی خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"اچھا تو کمانڈر صاحب، ہمارا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ خود کو دشمن کے حوالے اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ جسموں میں جان ہے اور ہاتھ پیر ہلانے کی سکت ہے۔"

"تو تم مقابلہ کرو گے؟" طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

"بالکل، یہ بہت ضروری ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"تب تم لوگوں سے جنگی قیدیوں ایسا سلوک کیا جائے گا اور جنگی قیدیوں کے ساتھ ہمارے ملک میں بہت بھیانک سلوک ہوتا ہے۔"

"بھئی واہ، بہت دن ہو گئے بھیانک سلوک سے دو چار ہوئے۔ چلو اچھا ہے، موقع ملنے والا ہے۔" فاروق بولا۔

"تو ہم تمہارے خلاف جنگ شروع کر رہے ہیں۔"

کمانڈر کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ان پر گولیوں کی باڑھ ماری گئی، لیکن وہ ابھی گولیوں کی زد سے باہر تھے، تاہم فوراً نیچے لیٹ گئے اور جلدی جلدی پوزیشنیں لینے لگے۔

"کاش، ہم کیپٹن ارشاد سے چند رائفلیں اور کارتوس ہی لے لیتے۔"
خان رحمان بڑبڑائے۔

"اب ہمارے پاس صرف ایک پستول ہے اور باقی لوگ صرف پتھروں سے کام لے سکتے ہیں۔"

"چلیے خیر، کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔" فرزانہ بولی۔

انہوں نے پتھر اٹھا لیے اور پہلا حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جونہی ان کے خیال کے مطابق دشمن نزدیک آیا۔ انسپکٹر جمشید نے پہلا فائر کیا اور ان سب نے پتھر دشمن پر پھینکے، لیکن جواب میں ایک بھی چیخ نہ ابھری۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کم از کم انسپکٹر جمشید کی گولی کے جواب میں تو ایک چیخ ضرور ہی ابھرنی چاہیے تھی۔

"جمشید، کیا تمہارا نشانہ بھی چوک گیا ہے؟"

"نن، نہیں۔" وہ بولے۔

"ابا جان، آپ نے نہیں کے دو ٹکڑے جان بوجھ کر کیے ہیں یا آپ ہکلائے ہیں؟"

"میں ہکلایا تھا۔ میری گولی بالکل ٹھیک نشانے پر لگی تھی، لیکن اس نے دشمن کے سپاہی کا بال بھی بیکا نہیں کیا، جس کا مطلب ہے، یہ فوجی بلٹ پروف لباس میں ہیں، اسی لیے تو پتھر بھی بے کار گئے ہیں۔"

"اُف خدا، اب کیا ہوگا؟" محمود نے کانپ کر کہا۔

"خان رحمان، محمود کے سوال کا جواب تم ہی دے سکتے ہو۔"

"میں ایک چھوٹی سی نہتی فوج کا نہتا کمانڈر ہوں۔ مقابلے میں سیکڑوں مسلح دشمن ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی جدید ترین ہے۔ یہ لوگ ان پہاڑیوں پر آتش گیر

مادہ پھینک کر انہیں آگ بھی دکھا سکتے ہیں۔ ان حالات میں میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم شہادت کی موت ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔"

"نہیں خان رحمان، یہ لوگ اتنے پاگل نہیں کہ ہمیں موت کے گھاٹ اتاریں، جب کہ انہیں ہماری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ ان حالات میں تو یہ بے خطر ہماری طرف بڑھتے چلے آئیں گے اور سیکڑوں رائفلوں کے مقابلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابا جان، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں خود کو ان فوجیوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

"ہاں، شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ ہم ان کی قید میں چلے جائیں۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن جمشید، یہ سوچ لو، ان لوگوں میں انسانیت نام کو بھی ہیں۔ رحم ان کے دلوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ یہ لوگ ہم پر انسانیت سوز مظالم توڑیں گے اور تم یہ بھی نہ بھولو کہ پروفیسر داؤد بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ کیا ہم ان پر ظلم ٹوٹتے دیکھ سکیں گے۔"

"نن، نہیں۔ لیکن خان رحمان، تم ہی بتاؤ، ہم مقابلہ کریں تو کس طرح۔ پتھر برسانے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"ابا جان، آپ تھوڑی دیر پہلے کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ آپ نے یہ الفاظ کہے تھے، اُف خدا، دشمن فوج کے اس طرف سے...... آپ کیا کہنا چاہتے تھے ابا جان؟" فرزانہ بول اٹھی۔

"ہاں، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دشمن فوج کے اس طرف سے آنے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ملک سے لے کر اس قصبے تک کوئی خفیہ سُرنگ نکال رکھی ہے شاید۔ تبھی تو یہ اس طرف سے آ گئے ہیں۔ سرحد کی طرف سے آتے تو

جھڑپ ضرور ہوتی اور اس جھڑپ کو پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں کیپٹن ارشاد اس وقت ہماری مدد کو آ چکا ہوتا، لیکن سرنگ والا خیال بھی درست ہے اور یہ لوگ چپ چپاتے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہیں، لیکن فرزانہ تم کیا کہتی ہو۔"

"یہ کہ کیوں نہ ہم اس سرنگ کے ذریعے ان کے ملک میں خود ہی داخل ہو جائیں۔ اس صورت میں شاید ہم بچاؤ کا کوئی راستہ تلاش کر لیں۔"

"ترکیب اچھی ہے، لیکن ہمیں سرنگ کا راستہ معلوم نہیں۔ نہ ہم اس سمت میں جا سکتے ہیں، جس سمت سے یہ فوج آئی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن ہم بلندی کی طرف بھاگ تو سکتے ہیں، آؤ چلیں۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے اور پھر جھکے جھکے بلندی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھیوں نے مجبوراً اُن کا ساتھ دیا۔ اسی وقت پیچھے سے آواز سنائی دی:

"ارے، تم لوگ کہاں جا رہے ہو، ادھر موت ہے۔ عمودی چٹانوں سے گر کر موت کو گلے لگا بیٹھو گے۔"

انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بس دوڑتے چلے گئے۔ اچانک انہیں اپنے سروں پر آگ کی بارش ہوتی محسوس ہوئی۔ آتش گیر مادہ پہاڑیوں پر اچھال کر فائر کیا گیا تھا اور انہیں آگ سے بچنے کے لیے رخ تبدیل کرنا پڑا۔

"شاید ہم زندگی میں اتنے بُرے کبھی نہ پھنسے ہوں گے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"پروفیسر انکل، آپ بالکل خاموش ہیں۔ کہیں ہم پر آپ کو غصہ تو نہیں آ رہا؟" محمود نے ان کی طرف دیکھا۔

"کیوں بھلا غصہ کیوں آنے لگا۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟" وہ مسکرائے۔ اور پھر ادھر بھی آگ کی بارش ہونے لگی۔ وہ خوف زدہ ہرنوں کی طرح

کبھی ادھر بھاگ رہے تھے تو کبھی ادھر۔ کتنی ہی چنگاریاں ان کے کپڑے چھلنی کر چکی تھیں۔

"بہت ستم ظریف دشمن ملا ہے اس مرتبہ۔" انسپکٹر جمشید نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا رہا ہے۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"ارے، وہ نور دین موچی کہاں گیا؟"

"شاید وہ وہیں رہ گیا تھا۔ جب ہم اُٹھ کر بھاگے۔ اس نے خود کو فوج کے حوالے کر دیا ہوگا اور بعد میں انہیں بتا دیا ہوگا کہ وہ اکبر بھورانی کا خاص آدمی ہے۔"

"لیکن انہیں یقین کس طرح آیا ہوگا؟" فرزانہ بڑبڑائی۔

"نہیں آیا ہوگا تو بعد میں یقین دلا دے گا، جب وہ لوگ بھورانی سے تصدیق کریں گے۔"

ان کے ادھر ادھر آگ کی بارش ہوتی رہی۔ گولیاں بھی برستی رہیں اور وہ اونچی نیچی چٹانوں کے ذریعے خود کو آگے بڑھاتے رہے، لیکن کب تک۔ آخر بھاگنے کا سلسلہ ختم ہو گیا، دشمن ان کے سروں پر پہنچ گیا، ان کا گھیرا تنگ ہو گیا۔ رائفلیں ان کے سینوں کا نشانہ لینے لگیں۔ اب اگر وہ حرکت کرتے تو گولیاں انہیں چھلنی کر دیتیں۔ ایسے میں اسی کمانڈر کی آواز ابھری:

"بس انسپکٹر جمشید، اب کہاں تک بھاگو گے۔ تمہارے مقدر میں قید لکھی ہے۔ قید کاٹنا ہوگی یا پھر ان عمودی چٹانوں سے چھلانگیں لگا کر جانیں دے دو۔ مقابلہ تو تم کر نہیں سکو گے، کیونکہ ہم سیکڑوں ہیں اور تم صرف چھ۔ چھ آدمی کب تک لڑو گے، آخر تھک جاؤ گے۔" کمانڈر کی زہریلی آواز ان کے کانوں میں گھستی چلی گئی۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں، ہاں بھئی، اب کیا کریں۔ اور پھر سب سے پہلے انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ، خود کو دشمنوں کے حوالے کر رہے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان لوگوں سے کسی نرم سلوک کی قطعاً کوئی امید نہیں۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، جانتا ہوں، لیکن اسلام نے ہمیں خودکشی کی اجازت نہیں دی اور اس وقت خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کرنا خودکشی کے برابر ہوگا۔" انہوں نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو جمشید، یہ لو، میں بھی ہاتھ اٹھائے دے رہا ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"اب جب کہ تم دونوں گرفتار ہونے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو، میں بھی ہاتھ اٹھا رہا ہوں۔" پروفیسر داؤد بجھے بجھے لہجے میں بولے۔

"اب ہم کیا کریں، ہم کیا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔" محمود بے چارگی کے عالم میں بولا۔

اور ان سب کے ہاتھ اوپر اٹھنے لگے۔ دشمن فوج کے سپاہی ان کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔

"خدا کو یہی منظور تھا اور خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

سپاہی نزدیک آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ ہتھکڑیاں پہننے کے لیے آگے بڑھا دیے۔ ان کے ملک کی سرزمین پر دشمن ملک کے فوجی انہیں ہتھکڑیاں پہنا رہے تھے۔ یہ کچھ کم تکلیف دہ بات نہیں تھی۔

☆☆

جوں ہی ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں۔ دشمن سپاہی ایک ساتھ چلائے۔

"کامیابی مبارک کمانڈر۔"

"تم سب کو بھی مبارک ہو۔ ہماری مدتوں کی آرزو آج پوری ہو گئی۔" کمانڈر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"یہ سب ایک چال تھی، ایک منصوبہ تھا، تم لوگوں کو گرفتار کرنے کا۔" کمانڈر بولا۔

"ہم اب بھی نہیں سمجھے۔"

"اکبر بھورانی کو حکم دیا گیا تھا کہ کسی طرح انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو گرفتار کیا جائے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا۔ دارالحکومت میں جا کر منصوبے کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لیا۔ نیاز روڈ شاہی سٹریٹ کے دو مکان اس منصوبے کی تکمیل کے لیے بہت مناسب نظر آئے، پھر جملات کو حکم دیا گیا کہ اکبر بھورانی کے نام سے مکان نمبر ۱۱۱۶ شاہی سٹریٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے رہائش اختیار کرے۔ اس بے چارے کو ہمارے منصوبے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، چنانچہ اس نے جا کر رہائش اختیار کر لی، پھر عرفان غازی کو حکم دیا گیا کہ جا کر ۱۱۱۷ نمبر مکان میں رہائش اختیار کرے اور جملات کو سیڑھی کے ذریعے ہلاک کر دے۔ تمہیں فون کرتے وقت غبارے سے خرخراہٹ کی آواز نکالے، تاکہ انسپکٹر جمشید یہ خیال کرے کہ قتل عین اسی وقت ہوا ہے۔ جان بوجھ کر غبارہ دروازے پر پھینکا گیا۔ باورچی خانے میں لوہے کے پائپ چھپا دیے جائیں۔ پولیس انسپکٹر جو کہ

ہمارا خاص آدمی ہے، کو اشارا دیا گیا۔ جب اسے موقعے پر بلایا جائے تو اکبر بھورانی کی سنسنی خیز کہانی سنا دے۔ اس طرح انسپکٹر جمشید اس قصبے میں آنے پر مجبور ہو جائیں گے، چنانچہ ہر کام منصوبے کے مطابق ہوا جملات کو پہلے ہی یہ بات بتا دی گئی تھی کہ ایک منصوبے کے تحت اسے جملات کے نام سے چار دھمکی آمیز خط ملیں گے، لیکن اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ ایک ڈراما ہوگا، لہٰذا وہ بے فکر رہا۔ یہاں تک کہ عرفان غازی کو اپنی آنکھوں سے سیڑھی کے ذریعے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا، لیکن چونکہ وہ اسے بخوبی جانتا تھا، اس لیے یہی سمجھا کہ یہ بھی اکبر بھورانی کے منصوبے کا ایک حصہ ہے اور واقعی وہ منصوبے کا ہی ایک حصہ تھا، چنانچہ دوسری طرف جا کر عرفان غازی نے نہایت اطمینان سے بے خبری کے عالم میں چاقو جملات کے جسم میں اتار دیا اور اسی راستے سے واپس آ کر سیڑھی اٹھالی، لوہے کے پائپ نکال کر باورچی خانے میں چھپا دیے۔ ہم جانتے تھے، انسپکٹر جمشید بہت جلد سراغ لگا لیں گے اور قصبہ جالوم کا رخ کریں گے اور یہی ہم چاہتے تھے، پھر ہوٹل گلنار میں جو کچھ ہوا اور دوسری طرف انسپکٹر جمشید کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ سب ایک ڈراما تھا۔ ڈراما تھا تم لوگوں کو ان پہاڑیوں تک گھیر گھار کر لانے کا، تاکہ تمہیں گرفتار کر لیا جائے۔ اس سارے پروگرام میں اگر کوئی غلط بات ہوئی تو وہ تمہارے ملک کی فوج کی آمد۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسپکٹر جمشید فوج کا انتظام بھی کر کے آئیں گے۔ خیر، فوج جلد ہی واپس چلی گئی اور ہم پروگرام کے مطابق یہاں پہنچ گئے۔ تو جناب یہ تھی تفصیل۔" یہاں تک کہہ کر کمانڈر خاموش ہو گیا۔

"حت، تو یہ سارا منصوبہ صرف اور صرف ہمیں گرفتار کرنے کا تھا۔" محمود چلا اٹھا۔

"ہاں بالکل۔"

"لیکن کیوں، تم لوگوں کو آخر اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ چلائے۔

"یہ تمہیں مسٹر ڈی سائٹ بتائیں گے۔" اس نے کہا۔

"اور یہ مسٹر ڈی سائٹ کون ہیں؟" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈی سائٹ ہمارے ملک کی ایک بہت اہم ہستی ہیں۔ خفیہ پولیس اور فوج ان کی ماتحتی میں کام کرتی ہے۔ ان کے اختیارات بھی بے پناہ ہیں۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں کرے گا۔ ہمیں حکم ہے کہ جوں ہی تم لوگوں کو گرفتار کیا جائے، ان کے سامنے پہنچا دیا جائے۔"

"تو میرے خیال میں آپ ہمیں گرفتار کر ہی چکے ہیں یا ابھی کوئی کسر رہتی ہے۔ کیوں محمود، فرزانہ تم دونوں کا کیا خیال ہے؟"

"ایک تو تم فضول باتیں بہت کرنے لگے ہو۔" فرزانہ تلملا کر بولی۔

"اور تم بلا ضرورت جلنے بھننے کی کوشش کرنے لگی ہو۔ کیوں محمود، ٹھیک ہے نا۔"

"پ، پتا نہیں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ اتنا لمبا چوڑا منصوبہ آخر کیوں بنایا گیا ہے؟" محمود بڑبڑایا۔

"یہ شریف لوگ بتا تو چکے ہیں کہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے تھے۔" فاروق بولا۔

"کیوں؟" محمود پر زور لہجے میں بولا۔

"اس کیوں کا جواب مسٹر ڈی سائٹ بتائیں گے۔ وہ بھی اس لیے بتائیں گے کہ ان کے پاس بے پناہ اختیارات ہیں۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"ویسے تو انہیں اختیارات کو پناہ دینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" فاروق

منہ بنایا۔

"توبہ ہے تم سے۔ دشمنوں کی قید میں پہنچ گئے اور پھر بھی چہک رہے ہو۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"تم لوگ بڑے شوق سے چہکتے رہو، لیکن ساتھ ساتھ قدم بھی اٹھاتے رہو۔ ہمیں کافی چلنا ہوگا۔" کمانڈر نے نرم آواز میں کہا۔

"چلیے جناب، آپ کے ڈی سائٹ سے ملنے کا اشتیاق تو ہمیں بھی پیدا ہو گیا ہے۔" فاروق بولا۔

"ویسے ان کا نام ڈی سائٹ کیوں ہے۔ بی یا جی سائٹ بھی تو ہو سکتا تھا۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"بری بات ہے فرزانہ، کسی کے نام پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔" محمود نے گویا نصیحت کی۔

ان کا قافلہ چل پڑا۔ اب وہ نیچے اتر رہے تھے۔ آدھ گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ ایک سرنگ کے دہانے پر پہنچے۔ سرنگ کے دہانے پر دس فوجی رائفلیں لیے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر اٹینشن ہو گئے۔ سرنگ پہاڑوں کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ اسے دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی۔ آگے چلتے ہوئے وہ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے تمام فوجی بھی سرنگ میں داخل ہو گئے۔ دس پہرے دار بھی اندر ہی آ گئے اور اسی وقت کمانڈر نے نہ جانے کیا کیا کہ سرنگ کے دہانے پر ایک بڑا سا پتھر سرک آیا، گویا اب سرنگ کا راستہ بند ہو گیا تھا اور شاید باہر سے سرنگ نظر بھی نہیں آ سکتی تھی۔ دہانہ بند ہوتے ہی اندر روشنی ہو گئی۔ سرنگ کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹنے لگی۔ ان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسی کسی سرنگ کی موجودگی کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

اب ان کا سفر سرنگ میں شروع ہوا۔ انہیں نہ جانے کیوں چپ سی سونگھ گئی تھی۔ یہ خیال سب سے پہلے فاروق کو آیا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سرنگ کو دیکھ کر ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو۔" اس نے پرسکون آواز میں کہا۔

"نہ صرف ہمیں، بلکہ ہمارے دشمنوں کو بھی۔" محمود مسکرایا۔

"کیوں بھئی، کیا یہ سرنگ تم لوگوں کے لیے بھی نئی چیز ہے؟" فرزانہ بولی۔

"ہمارے لیے نئی کیوں ہوتی۔ اس کی تیاری میں برسوں لگے ہیں۔"

"تو کیا اس سرنگ کا دوسرا سرا تمہارے ملک تک چلا گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں، دراصل یہ اسی لیے بنائی گئی ہے کہ ہم جب جی چاہے، تمہارے ملک میں دخل اندازی کر سکیں۔"

"اچھا ہی ہوا تم نے ہم لوگوں کو قید کر لیا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"وہ کیسے، بھلا تم لوگوں کے لیے کس طرح اچھا ہوا؟" کمانڈر نے حیران ہو کر کہا۔

"اب ہم اس سرنگ کو بند تو کرا سکیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"ایسے سنہری خواب ابھی تمہیں نہ جانے کتنے دیکھنے ہیں۔" کمانڈر طنزیہ لہجے میں مسکرایا۔

"خیر، دیکھا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

سرنگ میں انہیں تین گھنٹے تک چلنا پڑا۔ ان پر تھکاوٹ سوار ہونے لگی اور پھر تین گھنٹے بعد کہیں جا کر انہیں سرنگ کا دوسرا دہانہ نظر آیا۔ یہ بند نہیں تھا۔ یہاں بھی

دس مسلح فوجی کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر سیدھے ہو گئے اور جب وہ سب باہر نکلے تو وہ بھی ان کے پیچھے باہر نکل آئے۔ کمانڈر نے یہاں بھی نہ جانے کیا کیا کہ دہانہ بند ہو گیا۔ اب وہاں سرنگ کے کوئی آثار نہیں رہے تھے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ کوئی ایسا نشان ہی نظر آ جائے، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ سرنگ کا دہانہ اس جگہ ہے، لیکن نظر نہیں آیا۔

''بس اب ان کی ہتھکڑیاں کھول دو۔ ان کی ضرورت نہیں رہی۔'' کمانڈر نے کہا اور ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ ایسے میں محمود نے ایک زوردار ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل دھڑام سے گرا۔

''سنبھل کر۔'' انسپکٹر جمشید گھبرا کر اس کی طرف بڑھے۔

''خبردار، کوئی غلط حرکت نہ کرنا، ورنہ انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔''

''اوہو، گرے ہوئے کو اٹھانا غلط حرکت کس طرح کہلا سکتی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بھنا اٹھے۔ ساتھ ہی انہوں نے محمود کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

''خیر تو ہے، تم ٹھیک تو ہو؟''

''جی، جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ ذرا چکر آ گیا تھا، شاید سرنگ کی بند ہوا اثر ہو گیا ہے۔''

''بند ہوا، کیا کہہ رہے ہو۔ سرنگ تو ائیر کنڈیشنڈ ہے۔'' کمانڈر نے ہنس کر کہا۔

''اچھا، یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔'' محمود نے کہا۔

وہ پھر چلنے لگے۔ ایک بار مڑ کر دیکھا تو عمودی چٹانیں نظر آئیں: گویا وہ اب ان چٹانوں کے دوسری طرف دشمن ملک میں پہنچ چکے تھے۔

''ابھی اور کتنا پیدل چلنا ہے مسٹر کمانڈر؟''

''پیدل سفر تو بس اب ختم ہونے کے قریب ہے۔ باقی ماندہ سفر ہم جیپوں پر طے کریں گے۔''

''تو ابھی اور بھی سفر باقی ہے۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''ہاں، مسٹر ڈی سائٹ تم لوگوں کا یہاں تو انتظار نہیں کر سکتے تھے۔''

''خیر بھئی چلیے، اب ہم تمہارے قیدی ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں، جس قدر جی چاہے پیدل چلا لو، کبھی ہمیں موقع ملا تو اس قدر پیدل چلائیں گے کہ رہے اللہ کا نام۔'' فاروق نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''گویا تم بدلے میں ہمیں بھی قیدی بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' کمانڈر نے مسکرا کر کہا۔

''اگر ایسا موقع ملا تو ضرور بنائیں گے۔ ویسے مسٹر کمانڈر، تمہارا نام کیا ہے؟''

''غوربان۔'' اس نے بتایا۔

''غوربان، یہ کیا نام ہوا۔ کیا تم کوئی کام کرنے سے پہلے بہت غور کرنے کے عادی ہو۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''یہ بات تو تم نے بالکل ٹھیک کہی، لیکن یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا، کیا تم علم نجوم جانتے ہو؟'' کمانڈر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''علم نجوم تو نہیں، کالا علم ضرور جانتا ہوں اور اس کے مطابق یہ کہے دیتا ہوں کہ موت تمہارے سر پر کھیل رہی ہے۔'' فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''نن نہیں۔'' اس نے خوف زدہ ہو کر کہا اور جلدی سے سر کے اوپر دیکھا، پھر ہنس کر بولا:

''کیوں مذاق کرتے ہو۔ میرے سر کے اوپر تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اب اتنا بھی جھوٹ نہ بولو مسٹر سار بان، تمہارے سر پر کم از کم آسمان تو ہے ہی۔''

''سار بان نہیں، غور بان۔'' اس نے بھنا کر کہا۔

''اوہ، مجھے افسوس ہے۔ میں بھول گیا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو اپنا نام اتنا عزیز ہے۔'' فاروق سہم گیا۔

''آئندہ میرا نام سوچ سمجھ کر لینا۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''بہت بہتر مسٹر کار۔ نہیں ٹھہریے۔ پہلے سوچ اور سمجھ لوں، ہاں یاد آ گیا، بہت بہتر مسٹر غور...... بان۔'' اس نے نام کے دو حصے کیے۔ غور بان نے اسے گھور کر دیکھا۔

''بُری بات ہے فاروق، انہیں غصہ نہ دلاؤ۔ ہم ان کے قیدی ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ اور بھی بُرا سلوک کریں گے۔'' محمود نے گویا اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

''اور بھی بُرا سلوک سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''مطلب یہ کہ بُرا سلوک تو یہ کریں گے ہی۔ تمہاری بدتمیزیوں کیوجہ سے بُرے سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ جائیں گے۔''

''تو تمہارے خیال میں میں بدتمیز ہوں۔'' فاروق نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''ہاں، بالکل ہو۔'' محمود بولا۔

''کیا کہا، بالکل ہو۔ اچھا ٹھہرو، ابھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر فاروق محمود کی طرف جھپٹا۔

''ارے ارے، یہ کیا؟'' انسپکٹر جمشید بوکھلا اٹھے۔ فرزانہ بھی گھبرا کر آگے

...ی اور اپنے والد سے ٹکرا گئی۔ وہ زور سے گری اور لڑھکتی چلی گئی۔ پھر اٹھی اور چیخ کر ...لی:

''فاروق، میں تمہیں مزا چکھا کر رہوں گی، تمہاری وجہ سے مجھے زبردست ...ٹ آئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کی طرف دوڑی۔ اتنی دیر میں محمود خود کو بچانے کے ...یے بھاگ کھڑا ہوا تھا، گویا اب فاروق محمود کے پیچھے اور فرزانہ فاروق کے پیچھے بے ...ٹا شا دوڑ رہے تھے اور انسپکٹر جمشید ارے ارے کہتے ان کے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔

''اوہو، کیا ہو گیا ہے تم لوگوں۔ کچھ تو خیال کرو۔ یہ لوگ کیا کہیں گے، یہ ...ے قیدی ہیں۔'' پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔ پھر خان رحمان کی طرف مڑے۔

''خان رحمان، تم ہی دوڑ کر انہیں پکڑو، یہ پاگل تو نہیں ہو گئے۔''

''اچھا۔'' انہوں نے کہا اور دوڑ لگا دی۔

''مسٹر غور بان، کہیں یہ لوگ کوئی چال تو نہیں چل رہے۔'' ایک فوجی نے ...ا لباس سے وہ غور بان کا نائب لگتا تھا۔

''چال چل کر بھی کیا کر لیں گے۔ اپنے ملک میں تو کچھ کر نہیں سکے، یہاں ...کریں گے۔'' غور بان نے ہنس کر کہا اور دلچسپ نظروں سے اس دوڑ کو دیکھنے لگا۔ ...ڑ کے گویا پر نکل آئے تھے، اڑا جا رہا تھا۔ فاروق بھی کچھ کم تیز نہیں تھا۔ ادھر فرزانہ ...وڑنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید ان سے کافی پیچھے رہ گئے تھے اور ایسا لگتا ...یسے ان تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہوں۔ ادھر خان رحمان ان تک پہنچنے کی ...ش میں مصروف تھے۔

''بوڑھے انسان، تم ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ تم ...ؤ۔''

''مم، میں۔ یعنی کہ میں دوڑ دوں۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''ہاں، کیا تمہیں دوڑنا نہیں آتا؟''

''کچھ تو دوڑ ہی لوں گا۔'' وہ بے چارگی کے عالم میں بولے۔

''تو پھر دوڑو۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اگر تم نے انہیں چھولیا تو انعام دوں گا۔''

''اچھا۔'' انہوں نے کہا اور دوڑنے لگے۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ انعام کیا دو گے۔ مدت ہوئی، انہوں نے بھاگ دوڑ کا کام چھوڑ دیا تھا۔ لیکن انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ محمود اور فاروق نے دوڑنے کا سلسلہ بلاوجہ شروع نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کیا تھا، لہٰذا وہ جس قدر تیز دوڑ سکتے تھے، دوڑتے رہے۔ ان کے ساتھی اب ان سے بہت دور پہنچ چکے تھے، گویا وہ اپنے ساتھیوں اور دشمن فوج کے درمیان میں تھے۔

''دوڑو بوڑھے، دوڑو۔'' غوربان نے پرغرور لہجے میں کہا۔ وہ اور بھی تیز دوڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان سے بہت دور نکل آئے، لیکن محمود وغیرہ سے اب بھی بہت فاصلے پر تھے۔ اچانک انسپکٹر جمشید مڑے اور ان کی طرف دوڑنے لگے۔ پروفیسر داؤد بہت حیران ہوئے کہ انسپکٹر جمشید یہ کیا کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے یا کچھ کہہ سکتے، انسپکٹر جمشید ان کے نزدیک پہنچ گئے اور تیزی سے جھکتے ہوئے انہیں کندھے پر اٹھالیا، پھر اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بلا کی رفتار سے دوڑنے لگے۔

''جمشید، یہ کیا؟''

''محمود اور فاروق کام دکھا گئے پروفیسر صاحب، ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''لل، لیکن کیسے؟ جونہی غوربان اوہ، سوری۔ غوربان کو احساس ہوا کہ ہم

چال چل گئے ہیں، وہ پوری فوج کو ہمارے تعاقب میں دوڑا دے گا اور مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلے میں بالکل نہتے ہیں۔''

''آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ دیکھیے، کھیتوں کا بہت طویل سلسلہ۔ ایک بار ہم ان کھیتوں تک پہنچ گئے، پھر ان کے ہاتھ کہاں آئیں گے۔''

''اوہ۔'' پروفیسر داؤد کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں، وہ بولے۔

''جمشید، یہ تینوں حیرت انگیز ہیں، ان کا جواب نہیں۔ خدا کی قسم، ایسے بچے مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔''

انسپکٹر جمشید مسکرا کر رہ گئے۔ اگرچہ انہوں نے کندھے پر پروفیسر صاحب کو اٹھا رکھا تھا، پھر بھی اس قدر تیز دوڑ رہے تھے کہ جلد ہی خان رحمان تک پہنچ گئے اور اتنی دیر میں محمود کھیتوں کے سرے تک پہنچ چکا تھا۔

''ابا جان، کیا حکم ہے؟''

''بھئی، میں کیا حکم دوں گا۔ اس وقت تو اس فوج کی کمان تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ پھر پلٹ کر غوربان اور اس کی فوج کی طرف دیکھا۔

وہ سب کے سب اب بے تحاشا ان کی طرف دوڑ رہے تھے، کیونکہ ان کی چال اب ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔

☆☆☆

پہاڑی اُلّو

"دشمن نے دوڑ لگادی ہے۔ اب ہمارے لیے ٹھہرے رہنا مناسب نہیں، لہٰذا آؤ۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید پروفیسر داؤد سمیت نیچے اتر گئے۔

"بھئی اب تو مجھے نیچے اتار دو۔" انہوں نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ کچھ دُور جا کر۔ یہ لوگ آتے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیں گے۔ ہمیں اس سے پہلے پہلے بہت دور نکل جانا چاہیے۔ اتنی دور اور مختلف سمتوں میں کہ ان کی پہنچ سے باہر ہو جائیں۔"

"لیکن تم نے مجھے کندھے پر اٹھا رکھا ہے کھیت گنے کا ہے۔ اس طرح ہماری اونچائی بڑھ جائے گی اور میرا سر گنوں سے اونچا ہو جائے گا۔ وہ لوگ دیکھ لیں گے۔"

"جی نہیں، یہ گنے ہم سے بہت اونچے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ سب باتیں میری نظر میں ہیں۔"

"اچھا بھائی، جیسے تمہاری مرضی۔" انہوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

وہ بے تحاشا دوڑتے چلے گئے۔ ساتھ ساتھ وہ سمت بھی تبدیل کرتے جا رہے تھے۔

"یار جمشید، یوں ہم کب تک بھاگتے رہیں گے۔"

"ابھی ہمیں بہت بھاگنا ہے، ورنہ ہم ان کے ہتھے چڑھ جائیں گے مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں اور ان لوگوں نے بلٹ پروف لباس پہن رکھا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو کیا ہوا ابا جان، ان میں سے چند ایک سے دست بدست جنگ تو لڑی ہی جا سکتی ہے۔" محمود نے چونک کر کہا۔

"اوہ ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب میں ایک چال چلوں گا۔ آؤ واپس چلیں، لیکن ذرا چکر کاٹ کر۔"

"جی کیا مطلب؟"

"وہ سب لوگ اندھا دھند کھیتوں میں گھس پڑیں گے۔ شاید چند ایک کھیتوں سے باہر رہ جائیں۔ ہم پہاڑوں والی سمت میں ہی کھیت کے کنارے کے قریب چھپ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم اس قدر نزدیک چھپے ہوں گے۔ وہ تو یہی سوچیں گے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اندر گھسنے کی کوشش کریں گے۔"

"وری گڈ، بہت شاندار ترکیب ہے۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

"اور اس ترکیب پر عمل کر کے ہم واپس اس سرنگ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"ہاں، اس کا بھی امکان ہے، لیکن سرنگ کا دہانہ کس طرح کھولیں گے۔ ہمیں تو یہ تک معلوم نہیں کہ....."

خان رحمان کے لفظ درمیان میں رہ گئے۔ انہوں نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سُنی تھیں۔ وہ دبک گئے، سانس روک لیے۔ بے شمار دوڑتے قدم ان سے

کافی فاصلے پر گزرتے چلے گئے۔ اب وہ پھر حرکت میں آئے اور اس کنارے کی طرف بڑھنے لگے، جس سے کھیت میں داخل ہوئے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ کنارے کے نزدیک پہنچ گئے اور گنوں کے درمیان سے انہیں میدانی علاقہ کسی قدر نظر آنے لگا۔

''پہلے صرف میں کنارے تک جاؤں گا، پھر تم لوگ آؤ گے۔ اگر خطرہ ہوا تو میں خاموشی سے واپس پلٹ آؤں گا، ورنہ تم لوگوں کو اشارا کردوں گا۔'' انہوں نے دبی آواز میں کہا۔

''لیکن ابا جان، آپ اشارا کس طرح کریں گے۔ الو کی آواز تو یہاں مناسب نہیں رہے گی۔'' فرزانہ نے اعتراض کیا۔

''کیوں، کیا تمہارے خیال میں پہاڑی علاقے میں الو نہیں ہوسکتے، بھئی پہاڑی الو بھی تو ہوتے ہوں گے، جیسے پہاڑی طوطے۔'' فاروق منمنایا۔

''اچھا بھائی ہوتے ہوں گے پہاڑی الو بھی، لیکن اگر اس طرف کچھ دشمن موجود ہیں تو وہ الو کی آواز سن کر چونک سکتے ہیں۔'' فرزانہ نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا خیر، میں خود آکر تمہیں حالات سے باخبر کروں گا۔ فکر نہ کرو۔'' انہوں نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ پانچوں وہیں جم کر رہ گئے۔ سورج اب سر پر تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ سرے کے نزدیک آکر رک گئے۔ اب وہ سینے کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ پوری احتیاط کرتے ہوئے انہوں نے سر کنارے سے باہر نکال ہی لیا۔ دس کے قریب فوجی چوکس کھڑے تھے، لیکن ان کی نظریں کھیتوں کے اوپر ہی اوپر چاروں طرف طواف کر رہی تھیں۔ شاید وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کے قیدی کہاں ہیں۔ انسپکٹر جمشید نہایت خاموشی سے واپس مڑے اور اپنے ساتھیوں

کے پاس پہنچے۔

''وہاں دس دشمن موجود ہیں۔'' انہوں نے سرگوشی کی۔

''تب تو ان سے نبٹا جا سکتا ہے۔'' خان رحمان بولے۔

''ہاں، لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''ہم ان سے ہاتھوں اور پیروں سے لڑیں گے۔ اس کے سوا اب کوئی صورت نہیں۔ آؤ چلیں، اب خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہ کام نہایت خاموشی سے انجام دیا جائے۔ شور مچا نہیں اور تمام کے تمام دشمن کنارے کی طرف الٹے نہیں۔'' خان رحمان نے کہا۔

''تب پھر ان پر جا پڑنے کا پروگرام مناسب نہیں رہے گا۔'' فرزانہ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''لیجیے، اب کوئی پھڑکتی ترکیب سننے کے لیے تیار ہو جایئے۔'' فاروق نے طنز بھری آواز میں منہ سے نکالی۔

''خاموش، ان کے کانوں تک اگر ہم میں سے کسی کی سرگوشی پہنچ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

''ہاں فرزانہ، جلدی کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''کیوں نہ ہم ان میں سے ایک ایک کو کھیتوں کے اندر کھینچنے کی کوشش کریں۔''

''اوہ ہاں، بہت خوب فرزانہ۔ یہ وہ ترکیب ہے، جس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔'' انسپکٹر جمشید نے پُرجوش آواز میں کہا۔

''لیکن ابا جان، فرزانہ نے ابھی ترکیب کہاں بتائی ہے۔'' فاروق نے

مردہ پڑا تھا اور پروفیسر داؤد اس کا لباس پہن رہے تھے۔

"ہائیں، یہ ڈاکاف کے ساتھ روڈن بھی کھیت میں ہی رہ گیا۔ یہ لوگ اندر کیا کر رہے ہیں۔ ٹھہرو، میں ان کی خبر لیتا ہوں۔" تیسری آواز آئی اور وہ ایک بار پھر چوکس ہو گئے۔

تیسرا شکار جوں ہی ان کی زد پر آیا، خان رحمان نے اس کی کمر پر ایک زوردار ٹکر ماری۔ وہ دھڑام سے گرا اور اس مرتبہ گنے بہت زور سے ہلے۔ فوراً ہی آواز گونجی:

"ہائیں، یار اندر تم لڑ تو نہیں پڑے آپس میں۔"

دشمن نے اچانک پلٹا کھایا اور خان رحمان کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ زور سے گرے اور اگر اس وقت انسپکٹر جمشید حرکت میں نہ آ جاتے تو خان رحمان ضرور زخمی ہو گئے تھے، کیونکہ اس دشمن کے جوتے کے نیچے کیل لگے ہوئے تھے اور اس نے جوتے کا نچلا حصہ ان کے منہ پر مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن ان کی ٹانگ درمیان میں ہی رک گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا۔ عین اسی وقت ایک آواز ابھری:

"اندر ضرور گڑبڑ ہے، آؤ دیکھیں۔"

اب خطرہ بڑھ گیا۔ دیر کرنا مناسب نہیں تھا، لہٰذا انسپکٹر جمشید نے ایک بھرپور ہاتھ دشمن کی ناک پر جما دیا۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی اور دوسری طرف الٹ گیا۔ ساتھ ہی باہر سے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ وہ فوراً لیٹ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے دو تین بھرپور ٹھوکریں اس کے اور رسید کیں اور پھر جلدی سے اس کا بلٹ پروف لباس اتار لیا۔ ابھی پہن ہی پائے تھے کہ سات آدمی ان سب پر ٹوٹ پڑے۔ اب گنے کے کھیت میں خونریز جنگ ہونے لگی۔ رائفلیں اب لاٹھیوں کی

طرح استعمال ہونے لگیں۔ گولی چلانے کا موقع اب نکل چکا تھا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نازک پوزیشن میں تھے، کیونکہ ان کے جسموں پر بلٹ پروف لباس نہیں تھے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتے۔ انہوں نے جھکائی پر جھکائی دینے کا کام شروع کر دیا اور دشمنوں کو چکر پر چکر دینے لگے۔ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کے ہاتھ بجلی ایسی تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے، ان کے باقی ساتھیوں کے اس طرف متوجہ ہونے سے پہلے پہلے ان لوگوں سے فارغ ہو جائیں۔ انہوں نے دو آدمیوں کو تو آن کی آن میں زمین دکھا دی۔ تین کو محمود، فاروق اور فرزانہ الجھائے ہوئے تھے۔ باقی دو ان کے مقابل سنگینیں لے آئے اور ان کے ذریعے سے حملے شروع کر دیے۔ انسپکٹر جمشید نے ایک کو غچہ دیا۔ سنگین ان کے سینے سے ایک انچ کے فاصلے سے نکل گئی۔ ساتھ ہی دشمن کے سر پر ان کا دھپ زور سے لگا اور وہ گر پڑا۔ ساتھ ہی انہوں نے دائیں ہاتھ میں پکڑی رائفل کا کندہ اس کے سر پر دے مارا۔ خان رحمان اور دوسرے دشمن کے درمیان رائفلیں باقاعدہ لاٹھی کی طرح چل رہی تھیں، وہ انہی پر وار روک رہے تھے اور انہی سے حملہ کر رہے تھے۔ اچانک ان کی رائفل کی سنگین دشمن کی گردن کو چھوتی گزر گئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا تو محمود مردانہ وار ایک دشمن کی سنگین کے وار خالی دے رہا تھا۔ فاروق ایک دائرے میں چکر لگا کر دشمن کو تھکا رہا تھا۔ فرزانہ غچے پر غچہ دے رہی تھی۔ دونوں ان کی مدد کو آگے بڑھے اور پانچ منٹ بعد میدان ان کے ہاتھ تھا۔

"اب تم لوگ بھی جلدی جلدی بلٹ پروف لباس پہن لو۔" وہ بولے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ تیزی سے اس کام میں مصروف ہو گئے، اب ان کے پاس رائفلیں بھی تھیں اور لباس بھی بلٹ پروف تھے، لہٰذا پہلے کی نسبت وہ بہت بہتر پوزیشن میں تھے۔

کہا۔

''ڈی سائٹ ہمیں اپنا قیدی دیکھنا چاہتا ہے، کیوں دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اس کے قریب جانا گویا اس کی خواہش پوری کرنے کے برابر ہوگا۔ ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔ اگر گرفتار ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو شوق سے چلے جاؤ۔'' فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

''کیا خیال ہے، ابا جان؟''

''بھئی بات دراصل یہ ہے کہ ہم اب سرنگ کی طرف تو جا نہیں سکتے۔ ظاہر ہے، مخالف سمت میں ہی جائیں گے۔ زیادہ دیر ان کھیتوں میں بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ جلد ہی وہ بڑے پیمانے پر کھیتوں کو کھنگالنا شروع کر دیں گے اور ان کی ناکہ بندی بھی کر دی جائے گی۔ اس وقت ہم خود کو بے بس محسوس کریں گے۔ لہٰذا کیوں نہ ہم اس وقت سے پہلے ہی کھیتوں سے نکل جائیں۔'' انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

''بالکل ٹھیک، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔'' خان رحمان بولے۔

''تو پھر چلیے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس بار دشمن ملک کی سیر ہی سہی۔'' محمود نے کہا۔

وہ تیزی سے مخالف سمت میں چل پڑے۔ غوربان اور اس کے ساتھی سرنگ تک پہنچنے کی افراتفری میں کھیتوں پر توجہ نہیں دے رہے تھے۔ یوں بھی ان کے اپنے ساتھیوں کی وجہ سے گنے کے کھیتوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔

اچانک انہوں نے ہیلی کاپٹروں کی آوازیں سنیں۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ اوپر نگاہ کی تو چار ہیلی کاپٹر چلے آ رہے تھے۔

''تو یہ لوگ اسی لیے کھیتوں سے نکل رہے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید فکر مند ہو گئے۔

''جی کیا مطلب؟ کس لیے نکل رہے ہیں؟''

''ہیلی کاپٹر کھیتوں پر یا تو فائرنگ کریں گے یا پھر دھوئیں کے بم ماریں گے، تا کہ ہم بوکھلا کر باہر نکل آئیں۔''

''اوہ۔'' ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''تب پھر کیا کیا جائے؟''

''بس جس قدر تیز چلنا ممکن ہے، چلو۔ اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہیلی کاپٹروں سے اگر فائرنگ شروع ہو جائے تو سینے کے بل لیٹ جانا اور اگر دھوئیں کے بم مارے جائیں تو پھر بے ہوش ہو جانا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی کیا فرمایا، بے ہوش ہو جانا۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں، بوکھلا کر کھیتوں سے باہر نکل آنے کا مطلب گرفتاری کے سوا کچھ نہیں ہوگا، لیکن اگر ہم کھیتوں کے اندر ہی بے ہوش ہو گئے تو شاید دشمن ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

اسی وقت گولیوں کی تڑاتڑ شروع ہوئی۔ ہیلی کاپٹر ایک سرے سے شروع ہو گئے تھے اور کھیتوں کے دوسرے سرے کی طرف چلے جا رہے تھے، لیکن وہ اس سمت میں نہیں تھے۔ ہیلی کاپٹر شمالاً جنوباً فائرنگ کرتے تو اس صورت میں انہیں گولیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہٰذا وہ اطمینان سے چلتے رہے۔ اچانک فرزانہ بولی۔

''ابا جان، انہوں نے اپنے رخ تبدیل کر لیے ہیں۔''

''تو پھر سینے کے بل لیٹ جاؤ، اللہ ہی ہمارے حفاظت کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

وہ گیلی زمین پر لیٹ گئے اور خدا کو یاد کرنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ ہیلی کاپٹروں

”مم، میری۔ ارے باپ رے، اگر انہوں نے پلٹ کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔“ انہوں نے کانپ کر کہا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ فوراً ہاتھ اوپر اٹھا دیجیے گا۔ اس صورت میں یہ فائر نہیں کریں گے۔“

”لیکن اس طرح میں ان کی قید میں تو چلا جاؤں گا۔“ انہوں نے کانپ کر کہا اور مسکرا دیے۔

”تو کیا ہوا انکل، آپ کو تو معلوم ہی ہے، ابا جان کھیت سے نکل چکے ہیں۔ اب وہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئیں گے اور جوں ہی انہیں معلوم ہوا، آپ کو گرفتار کر لیا گیا ہے، وہ ہر قیمت پر آپ کو ان سے چھڑا لیں گے۔“

”میں جانتا ہوں، جمشید کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہوں، لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”دیکھیے انکل، یہ ڈر تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ خدا کے لیے جلدی کیجیے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے کہا اور رینگتے ہوئے کھیت سے نکل گئے۔

ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ انہیں زیادہ فکر پروفیسر داؤد کا ہی تھا۔ اب تو وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئے تھے کہ کاش، پروفیسر صاحب کو اس مہم پر ساتھ نہ لائے ہوتے، لیکن اس وقت کسے معلوم تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے۔ وہ تو اپنے ملک کے ایک قصبے میں ایک قاتل کا سراغ لگانے آئے تھے۔

پروفیسر داؤد نے تقریباً نصف راستہ طے کر لیا۔ عین اسی وقت فوجی اس جگہ سے منتشر ہونے لگے۔ پروفیسر داؤد کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہوں نے رفتار تیز کر دی۔ یہ دیکھ کر ان لوگوں کی جان میں جان آئی کہ فوجی کھیتوں کے مختلف کناروں کا

رخ کر رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے پیچھے نہیں دیکھا تھا اور اسی وقت پروفیسر داؤد مکان کے دروازے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اندر گھس گئے۔

اب وہ دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ کھیت کے کنارے سے نکلنا اب آسان نہیں رہا تھا، کیونکہ اب کھیت کے دونوں کناروں پر فوجی موجود تھے اور چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ حیرت تو یہ تھی کہ ابھی تک انہوں نے اس مکان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ انہیں تو سب سے پہلے اس مکان کو دیکھنا چاہیے تھا۔ اچانک فوجیوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوسری طرف چلے گئے۔ اب وہ انہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

”میدان صاف ہے انکل، اب کون جائے۔“ فاروق بولا۔

”چلو، تم ہی بسم اللہ کرو۔“ خان رحمان بولے۔

”جی بہتر، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔“ اس نے کہا اور کھیت سے نکل گیا۔ درمیان میں رکے بغیر وہ مکان تک پہنچ گیا۔ فوجی نہ جانے کدھر نکل گئے تھے۔ اس کے بعد فرزانہ کی باری آئی۔ اسے بھی کوئی خطرہ پیش نہ آیا، پھر محمود گیا۔ آخر میں خان رحمان نے کھیت سے سر باہر نکالا۔ میدان اب بھی صاف تھا، لہٰذا وہ بھی روانہ ہوئے جب بھی کوئی مکان میں داخل ہوتا تھا۔ دروازہ فوراً اندر سے بند کر دیا جاتا رہا تھا۔ اس وقت بھی دروازہ بند تھا۔ انہوں نے اسے دھکیلا اور اندر داخل ہو گئے۔ فوراً ہی ان کے سر پر کوئی وزنی چیز زور سے لگی اور ان کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے، پھر گہری تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

"ڈاکٹر، ان لوگوں کو جلد از جلد ہوش میں لانا ہے۔"

"یہ بے ہوش کس طرح ہوئے سر۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"آپ اس بے وقوف سام لٹ کو دیکھ رہے ہیں نا۔ اس نے ان کے سروں پر ڈنڈے برسا دیے ہیں۔"

"اوہ اچھا، فکر نہ کیجیے۔ یہ ابھی ہوش میں آ جائیں گے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے ایک زوردار چھینک ماری اور آنکھیں کھول دیں، پھر بوکھلا کر اٹھے اور چونک کر بولے۔

"یہ۔ یہ کیا۔ ہم کہاں ہیں؟"

"انسپکٹر جمشید ہوش میں آؤ۔ تم اس وقت مسٹر ڈی سائٹ کے سامنے موجود ہو۔" سام لٹ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اوہ۔" وہ چونک کر پہلے سام لٹ کی طرف مڑے، پھر اس لمبے آدمی کی طرف جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ڈی سائٹ ہے۔

"تو تم ڈی سائٹ ہو۔" انہوں نے جھلائے ہوئے انسان کے لہجے میں کہا۔ یہ ایک بہت لمبا آدمی تھا، تھا بھی بہت صحت مند۔

"ہاں، میں ڈی سائٹ ہوں۔ کیا تمہیں مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟"

"تم، تم چاہتے کیا ہو۔ ہمیں یہاں کیوں پکڑ بلوایا ہے۔ ہم سے تمہیں کیا دشمنی ہے؟"

"گھبراؤ نہیں، ابھی تمہارے تمام سولات کے جواب دوں گا۔" ڈاکٹر پہلے اس کے ساتھیوں کو ہوش میں لائیے۔"

"بہت بہتر سر۔ میں انجکشن تیار کرتا ہوں۔ انسپکٹر جمشید کو ہوش میں آتے دیکھ کر میں یہ خیال کر بیٹھا تھا کہ باقی لوگ بھی بس ہوش میں آنے والے ہی ہیں۔"

"اوہ ہاں، یہ کیا مشکل ہے۔ ٹھہریے، میں دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید ان پر جھک پڑے اور انہیں باری باری جھنجھوڑنے لگے۔

"اٹھو بھئی، کب تک سوتے رہو گے۔ اوہو نہیں، یہ سو کب رہے ہیں، یہ تو بے ہوش ہیں۔ ہاں تو اٹھو بھئی، کب تک بے ہوش رہو گے۔ اتنا بے ہوش رہنا بھی درست نہیں۔"

انہیں ہنسی آ گئی، لیکن وہ اس ہنسی کو چہروں پر نہ لا سکے۔ اندر ہی اندر مسکرا کر رہ گئے۔ انسپکٹر جمشید دراصل اس وقت ایک حواس باختہ انسان کا کردار ادا کر رہے تھے۔

آخر انہوں نے ایک ایک کر کے آنکھیں کھول دیں۔ خان رحمان بڑبڑانے کے انداز میں بولے:

"ہم۔ ہم کہاں ہیں جمشید؟"

"دشمن کی قید میں، ادھر دیکھو، یہ مسٹر ڈی سائٹ ہیں۔"

"ارے اچھا، بہت شوق تھا ان سے ملنے کا۔" یہ کہہ کر وہ پر جوش انداز میں ڈی سائٹ کی طرف لپکے اور خوش ہو کر بولے:

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی جناب، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی خوشی بھی ہو سکتی ہے۔"

"تم کون ہو؟" ڈی سائٹ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔ چہرے پر نفرت کے آثار تھے۔

"ہم، میں کون ہوں جمشید؟" وہ ان کی طرف مڑے۔

"خان رحمان ہو، میرے بہترین دوست۔"

"یہ۔ یہ غوربان کہیں غلط آدمیوں کو تو نہیں پکڑ لایا۔" ڈی سائٹ نے بوکھلا کر کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اتنے حواس باختہ لوگ انسپکٹر جمشید اور اس کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔" سام لٹ نے جلدی سے کہا۔

"غوربان کو بلاؤ۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ وہ ہے بھی اسی قابل۔" فاروق نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

"کس قابل؟" فرزانہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"کھال کھینچے جانے کے قابل۔ دیکھا نہیں تھا، ہمیں کس طرح بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑ لایا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔"

اسی وقت غوربان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"غوربان، بدتمیز، یہ تم کن لوگوں کو پکڑ لائے ہو؟"

"انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو سر، انہی لوگوں کے بارے میں آپ کی ہدایات تھیں اور مسٹر اکبر بھورانی نے اس سلسلے میں ہماری ہر طرح مدد کی۔ انہی کے منصوبے کے تحت تو یہ لوگ قصبہ جالوم تک پہنچے ہیں۔"

"مجھے پوری تفصیل سناؤ۔ میرا خیال ہے، یہ لوگ جمشید اور اس کے بچے نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟"

"میں نے کہا ہے، تفصیل سناؤ۔" ڈی سائٹ نے غرا کر کہا۔ غوربان کانپ اٹھا اور جلدی جلدی تفصیل سنانے لگا۔ آخر خاموش ہو گیا۔

"ہوں۔" ڈی سائٹ نے کہا اور ان کی طرف گھورا۔ اب اس کی آنکھیں انگارا بن گئی تھیں۔

"کیوں، کیا تم انسپکٹر جمشید ہو؟"

"اس میں کیا شک ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔"

"بالکل ہیں۔" وہ بولے۔

"اور یہ دونوں کون ہیں؟" اس نے خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی طرف دیکھا۔

"یہ میرے بہت ہی قریبی دوست ہیں۔"

"ہوں، ٹھہرو۔ پہلے میں اکبر بھورانی سے بات کر لوں۔ جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ لوگ اصلی انسپکٹر جمشید وغیرہ ہی ہیں، اس وقت تک میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔"

"ہم سو فیصد اصلی ہیں جناب، ابھی ہمارے ملک میں انسانوں میں ملاوٹ شروع نہیں ہوئی۔" فاروق نے کہا۔

اس نے جیسے فاروق کا جملہ سنا ہی نہیں۔ فون پر نمبر گھماتا رہا۔ جلد ہی سلسلہ مل گیا اور اس نے کہا:

"ہیلو بھورانی، بھئی یہ کیا چکر ہے۔ جن لوگوں کو تم نے غوربان کے حوالے کیا ہے، وہ تو اصلی انسپکٹر جمشید لگتے ہی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا، پھر بولا:

"پھر بھی تم تصدیق کر لو۔ کیا یہ لوگ اس وقت دار الحکومت میں موجود ہیں۔ ہاں...... میں انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور انہیں

گھورنے لگا۔

"آپ یقین کریں جناب، ہم بالکل اصلی ہیں، لیکن ذرا یہ تو بتائیں، آپ ہم سے چاہتے کیا ہیں؟"

"تمہارا اچار ڈالوں گا۔" اس نے منہ بنایا۔

"تب ہمارے اصلی یا نقلی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" فاروق بولا۔

"تم لوگ اتنی آسانی سے میرے قابو میں آ جاؤ گے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ بعض اوقات ہم جان بوجھ کر بھی دشمنوں کے قابو میں آ جاتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"وہ کیوں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس ہمیں بڑے بڑے دشمنوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے، ہر وقت بڑے بڑے مجرموں سے ملاقات ہوتی رہے۔" فاروق نے جواب دیا۔

"مہربانی کر کے تم خاموش ہی رہو، تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"آپ کی ہی نہیں، اور بھی بہت سے لوگوں کی سمجھ میں باہر ہیں۔" فرزانہ نے لقمہ دیا۔

"جی ہاں، ان بہت سے لوگوں میں یہ خود بھی شامل ہے۔"

"ہم نے مانا، ہم بہت آسانی سے آپ کے قبضے میں آ گئے۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ ہم آپ لوگوں کی چالوں کو سمجھ نہیں سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کیا کیوں گیا، آپ کو ہماری ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"میرے ملک کے سربراہ کا حکم یہی تھا کہ تم لوگوں کو اپنے یہاں قیدی رکھا

جائے۔" اس نے کہا۔

"آپ کے ملک کے سربراہ کا حکم۔" انسپکٹر جمشید نے مارے حیرت کے کہا۔

"ہاں، دراصل وہ تمہارے ملک میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کچھ کام لینا چاہتے ہیں، لیکن اس قسم کے کاموں کے ماہرین نے انہیں بتایا کہ اس ملک میں ایسے کام اس وقت تک آسانی سے نہیں کیے جا سکتے، جب تک انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو ملک سے باہر نہ نکال لیا جائے، چنانچہ انہوں نے مجھے حکم دیا۔ اس قسم کے کاموں کا ماہر مجھے سمجھا جاتا ہے۔ میں نے فوراً اکبر بھورانی سے رابطہ قائم کیا۔ اکبر بھورانی قصبہ جالوم یا پھر دوسرے لفظوں میں تمہارے ملک میں ہمارا پچیس سال پرانا ایجنٹ ہے اور اس وقت تک خاص مقام حاصل کر چکا ہے۔ میں نے اس سے رابطہ قائم کیا۔ اور اپنا منصوبہ اسے بتایا۔ منصوبے کی تمام تفصیلات میں پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ اکبر بھورانی کو تو بس ہدایات کے مطابق عمل کرنا تھا، چنانچہ اس نے عمل کیا اور نتیجے کے طور پر تم لوگ یہاں موجود ہو۔"

"لیکن تمہارے ملک کے صدر ہمارے ملک میں کیا کام کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ ان کا معاملہ ہے۔ ہم آپس میں ایسی باتیں نہ پوچھتے ہیں نہ بتاتے ہیں۔ ہر معاملہ راز رکھا جاتا ہے۔ یہ معاملہ بھی راز ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں، بہر حال میں تو بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اب وہ بڑی آزادی سے اپنے کام کرا سکتے ہیں۔ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

"غلط خیال ہے جناب۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیا مطلب، غلط خیال ہے۔ وہ کس طرح؟"

"ہمارے ملک میں صرف ہم ہی تو نہیں ہیں۔ ہم جیسے کچھ اور لوگ بھی ہیں، وہ راستے کے پتھر ثابت ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔ کچھ اور محب وطن لوگ بھی ہیں، جو وطن کی خاطر ہر آن قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ان دنوں چند بھائیوں کا نام بھی سننے میں آ رہا ہے۔ سنا ہے، وہ شوکی برادران کہلاتے ہیں۔"

"شوکی برادران، یہ نام میرے لیے نیا ہے۔ ہاں انسپکٹر کامران مرزا اور ان کے بچوں کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا، لیکن چونکہ فی الحال صدر صاحب تمہارے ملک کے مغربی حصے میں دخل اندازی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہاں، انہوں نے ادھر آ کر دخل اندازی کی تو ان سے بھی نبٹ لیا جائے گا۔"

"تو آپ کو یہ معلوم نہیں کہ صدر صاحب کیا کام لینا چاہتے ہیں۔"

"نہیں، اور نہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو بس اپنے کام سے کام رکھا کرتا ہوں اور فی الحال میرا کام یہ ہے کہ تم لوگوں کو اپنی قید میں رکھوں۔"

"چلیے جناب، پھر رکھیں قید میں۔ اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ابھی تمہارے بارے میں تصدیق نہیں ہو گی۔ میں بے کار لوگوں کو اپنی قید میں نہیں رکھ سکتا۔ ہاں، اگر یہ معلوم ہو گیا کہ تم واقعی انسپکٹر جمشید پارٹی ہو تو پھر ضرور میں تم لوگوں کو قید میں ڈال دوں گا۔"

"اور اگر یہ بات ثابت نہ ہوئی تو آپ کیا کریں گے۔"

"اس صورت میں تم لوگوں کو ملک کی عام جیل میں بھجوا دوں گا۔ اب تمہیں واپس تمہارے ملک بھجوانے کا انتظام کون کرے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب، ہم خود ہی چلے جائیں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"تم، تم کس طرح چلے جاؤ گے؟" اس نے چونک کر کہا۔

"اسی سرنگ کے ذریعے، جس سے ہمیں لایا گیا ہے۔"

"تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ شاید تم بھول گئے۔ تمہیں کھیتوں کے کنارے واقع مکان سے بے ہوش حالت میں یہاں تک لایا گیا ہے۔ تم کیا جانو کہ وہ کھیت اور مکان کس طرف ہیں۔"

"ہم تلاش کر لیں گے انہیں، آپ فکر نہ کریں، بس ہمیں اجازت دے دیں۔" فاروق نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی سائٹ نے ریسیور اٹھایا اور بولا:

"ہیلو، ڈی سائٹ بول رہا ہوں۔" یہ کہہ کر دوسری طرف کی بات سننے لگا، پھر بولا:

"تو تم نے پوری طرح اطمینان کر لیا ہے؟"

آخر اس نے ریسیور رکھا اور انہیں بغور گھورتے ہوئے بولا:

"اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ تم لوگ واقعی انسپکٹر جمشید پارٹی ہو۔ اس میں اب کوئی شک نہیں رہا، لہٰذا اب میں پھر حیران ہوں کہ تم کیسے انسپکٹر جمشید ہو اور کیسی تمہاری پارٹی ہے۔ تم تو میرے جال میں چوہوں کی طرح پھنس گئے۔"

"بس جی، عقلیں گھاس چرنے چلی گئی تھیں، جب عرفان غازی کا فون ملا۔" فاروق نے مسکین سی صورت بنائی۔

"انسپکٹر جمشید تمہارا یہ بیٹا بہت بولتا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"اس سے یہ شکایت ہمیں بھی ہے۔" فرزانہ نے چہک کر کہا۔

"خیر، تم سے ملاقات بہت پھس پھسی رہی۔ میں سمجھتا تھا، کچھ خاص قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ بھئی غوربان انہیں لے جاؤ۔ اور خاص جیل میں ڈال دو۔ ان کے لیے تو تم ہی کافی ہو۔"

"شکریہ سر، چلو بھئی۔" غوربان نے کہا۔

"تو کیا ان کے ساتھ میں بھی نہ جاؤں؟" سام لٹ بولا۔

"نہیں، کیا ضرورت ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ غوربان، انہیں لے جاؤ۔"

"جی بہتر۔"

اور وہ بجھے بجھے سے غوربان کے ساتھ باہر نکل آئے۔ یہاں ملٹری کی بند وین تیار کھڑی تھی۔ انہیں وین کے پچھلے حصے میں بٹھایا گیا۔ جلد ہی وین روانہ ہوگئی۔

"ابا جان، یہ تو ہماری بہت بے عزتی ہوگئی۔" فرزانہ منہ بنا کر بولی۔

"یہ بے عزتی میں نے خود ہی کرائی ہے۔" انہوں نے دبی آواز میں کہا۔

"جی کیا مطلب، خود ہی کرائی تھی، لیکن کیوں؟"

"ابھی کچھ نہ پوچھو۔ اس وین میں کچھ بتانا مناسب نہیں، اور ہاں۔ محمود، ذرا اپنا چاقو دینا۔"

"تو کیا، آپ کام شروع کرنے لگے ہیں؟"

"وین کا تالا کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کھل گیا تو کیا ہی بات ہے۔"

محمود نے چاقو نکال کر انہیں دے دیا اور وہ تالے کے سوراخ پر جٹ گئے، لیکن کچھ نہ بنا۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی رک گئی اور پچھلا دروازہ کھلا۔

"نیچے اتر آؤ۔"

"بہت بہتر مسٹر غوردان.... سوری بان۔" فاروق جلدی سے

بولا۔ غوربان نے اسے گھور کر دیکھا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

وہ وین سے نکلے تو معلوم ہوا، وین ایک عمارت کے اندر روکی گئی تھی۔ اس عمارت کے چاروں طرف کوٹھڑیاں تھیں اور ان کے اندر قیدی تھے۔ یہ قیدی سلاخوں سے لگے انہیں گھور رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے کہا:

"وہ آگئے نئے شکار۔ اب نئی چیخیں سننے کو ملیں گی۔ بھئی واہ، کچھ تو سننے کو ملے گا۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"تم لوگوں کے لیے وہ سامنے والی کوٹھڑی ہے۔ چپ چاپ اس میں چلے جائیے۔ رہا چیخوں کا معاملہ، میں مسٹر ڈی سائٹ سے اجازت لے لوں، پھر تمہاری چیخیں بھی سنا دی جائیں گی ان لوگوں کو۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ گاڑی جس دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی، وہ لوہے کا تھا اور گاڑی کے اندر داخل ہونے کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ صرف غوربان اور اس کے چھ ماتحت اندر آئے تھے۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید آگے بڑھے۔ انداز ایسا تھا، جیسے کوٹھڑی کی طرف جانا چاہتے ہوں، لیکن اچانک وہ ایڑی پر گھوم گئے اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے محمود کے چاقو کی نوک غوربان کی گدی پر رکھ دی۔ ان کی سرد آواز جیل کے احاطے میں گونجی:

"ایک انتہائی تیز ترین چاقو اس وقت تمہاری گردن پر ہے میرا ہاتھ چلنے کی دیر ہے، تمہاری گردن کٹ کر دور جا گرے گی۔ بہتر یہی ہے کہ دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دو اور جو کچھ میں کہوں گا، اس پر عمل کرو۔ تمہارے ساتھی بھی ہاتھ اٹھا دیں۔"

غوربان کا چہرہ ست گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اس کے ساتھ اس کے ساتھیوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے۔

"تم حماقت کا ثبوت دے رہے ہو۔ اس احاطے سے باہر نہیں نکل سکو گے۔" غوربان غرایا۔

"خاموش رہو، میں نے تمہیں بولنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر اب زبان ہلائی تو چاقو کم از کم ایک انچ گردن میں اتار دوں گا۔" انسپکٹر جمشید دبی آواز میں غرائے۔ غوربان نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اب تم لوگ ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لو۔"

وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھے اور ان کے اسلحے اور دوسری چیزوں پر قبضہ کر لیا، پھر چند قدم پیچھے ہٹ آئے اور رائفلیں ان کی طرف تان دیں۔ اسی وقت ایک قیدی زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ اس نے خوش ہو کر کہا:

"بھئی واہ، اب سنائی دیں گی چیخیں، اصلی چیخیں۔"

تلاشی لینے پر چابیوں کا ایک گچھا بھی ملا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے فرزانہ سے کہا۔

"اس کوٹھری کا دروازہ کھول دو، جس میں یہ ہمیں بند کرنے والے تھے۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور چابیاں لے کر کوٹھری کے دروازے پر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔

"باقی لوگ یہیں ٹھہریں گے۔ صرف میں اور غوربان اس کوٹھری کے اندر جائیں گے۔ چلو غوربان۔"

"آپ کا پروگرام کیا ہے ابا جان؟" محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

"ابھی کچھ نہ پوچھو۔ وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔"

یہ کہہ کر وہ غوربان کو چاقو کی نوک کے ذریعے آگے دھکیل لے گئے۔ کوٹھری کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا۔ پورے پندرہ منٹ بعد

دروازہ کھلا اور اس میں سے غوربان باہر نکلا اس کے پیچھے انسپکٹر جمشید نظر نہیں آئے۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ خان رحمان نے پریشان ہو کر اس کی طرف رائفل تان دی:

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خان رحمان، یہ میں ہوں۔" انہوں نے انسپکٹر جمشید کی آواز سنی۔

"ارے، لیکن آپ نے غوربان کا میک اپ کس طرح کر لیا؟"

"میں میک اپ کا واجبی سامان لے کر آیا تھا۔ یہ سامان میری کمر کے گرد ایک پیٹی سے بندھا ہوا تھا۔ اس وقت وہی کام آیا ہے۔ اب ان لوگوں کو بھی اس کوٹھری میں لے جاؤ۔ ایک ایک کو لے جاؤ اور باندھ باندھ کر ڈالتے رہو۔ ان کے منہ میں رومال ٹھونسنا نہ بھولنا، ورنہ یہ شور مچائیں گے، جب کہ میں یہ چاہتا ہوں، باہر اس تبدیلی کا علم کسی کو نہ ہو۔"

"جی بہت بہتر۔" محمود نے پر جوش لہجے میں کہا۔

اس کام میں پندرہ منٹ اور صرف ہوئے۔ اس کے بعد وہ صحن میں کھڑے نظر آئے۔ میک اپ صرف انسپکٹر جمشید ہی کر سکتے تھے۔ باقیوں کے جسموں پر پہلے ہی دشمن فوجیوں کے لباس تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں بہت عجیب سے لگ رہے تھے۔

"اب میں اس قید خانے کے قیدیوں سے دو دو باتیں کر لوں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک کوٹھری کے دروازے پر جا کر کھڑے ہوئے اور بولے:

"آپ لوگ آزاد ہونا پسند کریں گے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، ہم تو ان لوگوں کی چیخیں بھی سننا پسند کریں گے۔" ایک قیدی بولا۔

"ہم تم لوگوں کو اس قید خانے سے نکالنے کی ذمہ داری لیتے ہیں، لیکن تم

لوگوں کو میری ایک بات ماننا ہوگی۔"

"اور وہ کیا؟" کئی قیدی پرشوق لہجے میں بولے۔

"یہ کہ آج رات اور صبح تم لوگوں کو کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ اگر محافظ کھانا اندر لائے تو انہیں اس تبدیلی کا علم ہو جائے گا، جو ہم یہاں لا چکے ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے، لیکن کھانا اور ناشتا تو نگران بہر حال لائیں گے۔"

"نہیں لائیں گے، جب میں انہیں حکم دے دوں گا تو پھر کس طرح لائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، ہم آزادی کے لیے ایک دن کیا، کئی دن بھوکے رہ لیں گے۔"

"کیا تم سب لوگ اسی ملک کے ہو؟"

"نہیں، اس قید خانے میں ملکی آدمی ایک بھی نہیں ہے۔ سب کے سب غیر ملکی ہیں۔" ایک بولا۔

"تو پھر صبر سے انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے، ہم رات میں ہی کسی وقت لوٹ آئیں، ورنہ پھر صبح تک تو ضرور آئیں گے اور تم سب کو آزاد کرا لے جائیں گے۔ ہم ملک سے باہر نکلنے کا راستہ بھی تمہیں بتائیں گے۔ تم سب اپنے اپنے ملک جا سکو گے۔ فکر نہ کرو۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

"چلو بھئی، تم لوگ وین کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاؤ۔ میں دروازہ بند کر دوں گا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔ تم لوگ ہر صورت حال کے لیے پوری طرح تیار رہنا۔ ایسا نہ ہو، ہم ان قیدیوں سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکیں۔"

"فکر نہ کریں ابا جان۔" فرزانہ جذبات سے لبریز آواز میں بولی۔

وہ وین میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا، پھر لوہے کے دروازے پر دھپ کرنے ہی لگے تھے کہ ایک خیال آنے پر رک گئے اور قیدیوں کی ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔

"کیوں بھئی، دروازہ کھولنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟"

"تین بار انگلی سے کھٹ کھٹ کریں، چوتھی بار دھپ رسید کریں۔"

"اوہ۔ خدا کا شکر ہے، مجھ سے غلطی ہونے لگی تھی۔" انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ تین بار انگلی سے کھٹ کھٹ کی اور پھر دھپ رسید کر کے وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

دروازہ فوراً ہی کھلا اور وین بیک ہوتی باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر رک گئی اور انسپکٹر جمشید غوربان کی آواز میں بولے:

"اندر جن لوگوں کو قید کیا گیا ہے، وہ انتہائی چالاک اور حد درجے خطرناک ہیں اور مسٹر ڈی سائٹ کے خاص قیدی ہیں، لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آج رات اور صبح قیدیوں کو کچھ کھانے پینے کو نہ دیا جائے، کیونکہ دروازہ کھولنا خطرناک ہوگا۔ مطلب یہ کہ سبھی قیدی بھوکے رکھے جائیں۔ اس حکم پر سختی سے عمل کیا جائے۔"

"لیکن سر، یہ سر پھرے لوگ تو چلا چلا کر ناک میں دم کر دیں گے۔" ایک نگران نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ منہ سے آواز بھی نہیں نکالیں گے۔ میں نے اس کی ترکیب کر لی ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وین آگے بڑھ گئی۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے ابا جان؟" اندرونی دیوار والے سوراخ میں سے محمود نے پوچھا۔

"ذرا ڈی سائٹ سے ملیں گے۔" وہ بولے۔

''لیکن اس کی کیا ضرورت ہے جمشید، ہم لوگ یہیں سے سرنگ کا رخ کر سکتے ہیں۔'' پروفیسر داؤد پریشان ہو کر بولے۔

''نہیں پروفیسر صاحب، یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں کیا کام کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''لیکن یہ بات ڈی سائٹ کو نہیں، اس ملک کے صدر کو معلوم ہے۔'' خان رحمان نے اعتراض کیا۔

''بس دیکھتے جاؤ، اس وقت تک ڈی سائٹ کی مرضی کے مطابق ہر کام ہوتا رہا ہے، اب ہماری باری ہے۔'' وہ بولے۔

''لیکن آپ ڈی سائٹ کے گھر تک کس طرح جائیں گے۔ بند وین میں کیا آپ راستوں کا اندازہ لگا سکے تھے؟''

''یہ کوئی مشکل نہیں۔ ڈی سائٹ بہت مشہور آدمی ہے۔ اس کے گھر کا پتا معلوم ہو جائے گا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ اور پھر ایک چوراہے پر وین روک کر انہوں نے چوراہے پر کھڑے ایک کانسٹیبل کو اشارا کیا۔ وہ دوڑ کر آیا اور تھر تھر کانپتی آواز میں بولا:

''یس سر۔''

''مجھے مسٹر ڈی سائٹ کے گھر جانا ہے، لیکن میری طبیعت بہت خراب ہے۔ کیا تم گاڑی چلا سکتے ہو۔''

''کیوں نہیں سر۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''کیا تم جانتے ہو، میں کون ہوں؟''

''یہ بات کون نہیں جانتا، آپ مسٹر ڈی سائٹ کے ذاتی عملے سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا نام مسٹر غوربان ہے۔''

''خوب، تم بہت عقل مند ہو، چلو بیٹھ جاؤ اور گاڑی چلاؤ اور ہاں مجھے بہت جلدی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں سر، میں ڈرائیونگ میں بہت ماہر ہوں اور پچھلے سال میں نے انعام بھی جیتا تھا۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اب ذرا عملی طور پر ثبوت دو۔'' وہ بولے۔

''او کے سر، لیکن میری ڈیوٹی کا کیا ہوگا سر، میری تو رپورٹ ہو جائے گی۔''

''فکر نہ کرو، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اس وقت میرا سر بہت چکرا رہا ہے، کہیں گاڑی ادھر ادھر نہ ٹکرا دوں اور ادھر مسٹر ڈی سائٹ کا حکم ہے کہ جلدی پہنچوں۔''

''بہت بہتر، یہ لیجیے، میں چل پڑا۔'' باتونی کانسٹیبل نے کہا۔

گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی اور روانہ ہو گئی۔ اندر بیٹھے ان کے ساتھی حیران رہ گئے کہ انہوں نے یہ مسئلہ کتنی آسانی سے حل کر لیا تھا، لیکن چونکہ گاڑی میں کانسٹیبل موجود تھا، اس لیے بات چیت نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا دم سادھے بیٹھے رہے، آخر خدا خدا کر کے وین رکی اور کانسٹیبل کی آواز ابھری:

''لیجیے، ہم پہنچ گئے۔''

''شکریہ، اب تم کسی ٹیکسی سے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاؤ اور اگر کوئی بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔''

''او کے سر۔'' اس نے کہا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا چلا گیا۔

''تم لوگ اندر ہی بیٹھے رہو، پہلے میں دستک دوں گا، پھر صورت حال کے مطابق تمہیں ہدایات دوں گا۔''

''جی بہتر۔'' محمود نے کہا۔

انسپکٹر جمشید وین سے اترے اور گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک منٹ بعد

دروازہ کھلا اور سام لٹ کی صورت دکھائی دی۔ دروازے پر غوربان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"خیر تو ہے غوربان؟ تم پھر آ گئے۔"

جواب میں اس کی ٹھوڑی پر ایک بھرپور مکا لگا۔ وہ تیورا کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ مکا کچھ اسی انداز کا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے تیزی سے جھکتے ہوئے اسے کندھے پر ڈالا اور وین کے پچھلے حصے کی طرف لے آئے، سوراخ میں سے ان کے ساتھی یہ منظر دیکھ رہی رہے تھے، انہوں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"اسے بھی باندھ دو، ٹائی سے کام چلاؤ اور منہ میں رومال بھی۔" انہوں نے کہا۔

محمود اور فاروق نے آن کی آن میں اسے باندھ کر رکھ دیا۔

"نیچے اتر آؤ اور وین کا دروازہ بند کر دو۔"

وہ آگے بڑھے اور دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ راستہ کم از کم ان کا جانا پہچانا تھا۔

ڈی سائٹ کے کمرے میں موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا، لیکن کھڑکیاں کھلی تھیں۔ انہوں نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ محمود نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ چٹخنی لگنے کی آواز بھی موسیقی کی آواز تلے دب گئی۔ ڈی سائٹ کمرے میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، تاہم غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ نہا رہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رائفلوں کا رخ غسل خانے کی طرف ہو گیا۔ آخر دروازہ کھلا اور ڈی سائٹ تولیے میں لپٹا باہر نکلا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ حیرت کی زیادتی سے وہ چلا اٹھا۔

"غوربان، تم۔ تم ان لوگوں کو واپس کیوں لے آئے؟"

"ہاتھ اوپر اٹھا کر بات کرو ڈی سائٹ۔ غوربان اس وقت قید خانے میں آرام کر رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز کمرے میں ابھری۔ ڈی سائٹ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ ان میں خوف سمٹ آیا۔ مشینی انداز میں اس کے ہاتھ اوپر اٹھتے چلے گئے۔

"یہ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"جو لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ چالاک خیال کرتے ہیں، وہ اسی طرح مار کھا جایا کرتے ہیں۔ تمہیں اپنی ذہانت پر بہت ناز تھا اور تم نے ہمیں بالکل چوہوں کی طرح پکڑ لیا تھا، لیکن دیکھ لو، ہم بھی تمہاری قید سے اس طرح نکل آئے ہیں، جس طرح مکھن سے بال۔ بلکہ ہم نے تو اس کوٹھڑی میں قدم تک نہیں رکھا۔ ہاں غوربان اور اس کے ساتھی ضرور اس میں بند ہیں اور مزے کی بات یہ کہ قید خانے کے محافظوں کو اس تبدیلی کی کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ میں تم سے شاہانہ سلوک کر سکتا ہوں۔ اگر تم میرے چند سوالات کے جواب دے دو۔ بصورت دیگر تمہیں موت کو گلے لگانا ہی ہو گا۔"

"تم۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"تم نے بتایا تھا، تمہارے ملک کے صدر ہمارے ملک میں کچھ کارروائیاں شروع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن ہماری موجودگی میں ان کارروائیوں کی دال گلنے کا امکان نہیں تھا، لہٰذا تمہیں حکم دیا گیا کہ ہمیں پکڑ کر یہاں لے آیا جائے، چنانچہ ہم یہاں آ گئے۔ تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کارروائیوں کے بارے میں تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں، لیکن مجھے تمہاری اس بات پر یقین نہیں۔ میں جانتا ہوں، تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔"

"تم یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"تم اس ملک کے معمولی آدمی نہیں ہو، لہٰذا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ صدر نے تم سے کوئی بات چھپائی ہو۔ دوسرے یہ کہ تم یہ کہہ رہے تھے کہ میں اپنے کام سے کام رکھا کرتا ہوں۔ اس وقت تمہارے چہرے کے تاثرات پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ تم سفید جھوٹ بول رہے ہو اور یہ کہ ان کارروائیوں کے بارے میں تمہیں سب کچھ معلوم ہے، لہٰذا میں جاننا چاہتا ہوں، ان کارروائیوں کی تفصیل کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تب پھر ہمیں بھی تمہاری ضرورت نہیں۔ خان رحمان اس کی پیشانی میں گولی اتار دو۔"

خان رحمان نے ایک لفظ کہے بغیر رائفل سیدھی کی اور انگلی سے ٹریگر پر دباؤ ڈالنے لگے۔ اچانک فرزانہ چلا اٹھی:

"ایک منٹ انکل، گولی چلنے کی آواز ہمیں مشکل میں مبتلا کر دے گی۔ میں ذرا موسیقی کی آواز اور اونچی کر دوں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

"غلط ترکیب تو یہ بتا ہی نہیں سکتی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

فرزانہ نے آگے بڑھ کر آواز پوری کھول دی، پھر مڑتے ہوئے بولی:

"اب آپ اپنا کام نہایت اطمینان سے کر سکتے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں گزرے گا کہ اس ملک کی ایک اہم شخصیت کو موسیقی کے شور میں گولی مار دی گئی اور گولی مارنے والے وہ لوگ تھے جنھیں اہم شخصیت چوہوں کے برابر خیال کر بیٹھی تھی۔"

خان رحمان نے ڈی سائٹ کی پیشانی کا نشانہ لے لیا، لیکن وہ شدید

الجھن میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے صاف حکم دیا تھا کہ گولی مار دی جائے، لیکن دوسری طرف ان کا بیان یہ تھا کہ ڈی سائٹ کو حکومت کے منصوبوں کا علم ہے۔ اس صورت میں تو اسے ختم کر دینا عقل مندی نہیں تھی، تاہم وہ یہ بات بھی جانتے تھے، انسپکٹر جمشید نے یہ حکم بلاوجہ نہیں دے دیا۔ آخر انہوں نے ٹریگر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک ڈی سائٹ کے چہرے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ اچانک اس نے کہا:

"ٹھہرو، میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔"

خان رحمان کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ہاں جمشید، اب کیا کہتے ہو؟"

"ٹھہر جاؤ خان رحمان، لیکن نشانہ پیشانی کا ہی لیے رہنا۔ ڈی سائٹ اس جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہ کرے۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ مسکرائے۔

"جلدی بتاؤ ڈی سائٹ، وہ کیا منصوبے ہیں، جن پر تمہارا صدر ہمارے ملک میں کام شروع کرانا چاہتا ہے؟"

"ہم نے تمہاری فوج کو بزدل بنانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ سوچا ہے۔ اس طریقے پر عمل شروع ہونے ہی والا ہے۔" اس نے کہا۔

"اور وہ طریقہ کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو گئے۔

"اس کے علاوہ تمہارے ملک کے عوام کی اکثریت کو نشہ آور دواؤں کا عادی بنا دینے کا ایک جدید طریقہ سوچا گیا ہے۔" اس نے ان کی بات کا جواب دیے بغیر کہا۔ لہجے میں نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"تیسرے پیمانے پر انتظامی ڈھانچے کی باری آتی ہے۔ ملک کی انتظامیہ کے اعلیٰ ارکان ایک ایک کر کے خرید لیے جائیں گے۔ انہیں خریدنے کے لیے بھی جدید ترین حربوں سے کام لیا جائے گا۔ پھر اکبر بھورانی وغیرہ کو اشارا دے دیا جائے گا کہ ہر شہر میں ایک اکبر بھورانی حکمران بن جائے۔ پچاس سال بعد نتیجہ یہ نکلے گا کہ پوری قوم تباہی کے گڑھے تک پہنچ جائے گی اور حکومت عملی طور پر ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ فوج کو بزدل کس طرح بنا دیا جائے گا۔"

"فلموں کے ذریعے، جنگ کے موضوع پر ہم نے ہزاروں فلمیں تیار کرائی ہیں۔ یہ فلمیں ہمارے ملک کا کوئی شہری نہیں دیکھ سکا۔ صرف ان ماہرین نے دیکھی ہیں، جو اس منصوبے کے لیے عملی کام کر رہے ہیں۔ اب یہ فلمیں چوری چھپے فوجیوں تک پہنچائی جائیں گی۔ ان میں عریانی اور فحاشی کے ساتھ ساتھ جنگ سے نفرت پیدا کرنے والے واقعات ہیں۔ جنگ کی ہولناکیوں کی ایسی کہانیاں فلمائی گئی ہیں کہ آہستہ آہستہ فوج جنگ سے نفرت کرنے لگے گی اور بزدل ہوتی چلی جائے گی۔ دوسری طرف ہم نے اپنی فوج کے لیے جرأت مندانہ کارناموں سے لبریز فلمیں تیار کرائی ہیں۔ ان میں سے ایک فلم بھی تمہارے ملک میں نہیں جا سکے گی۔ یہ صرف ہمارے فوجی اور شہری دیکھیں گے۔" وہ کہتا چلا گیا۔ اس کے الفاظ ان کے جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑاتے چلے گئے۔

"اور نشہ آور ادویات اب ہم اپنے ملک میں تیار نہیں کریں گے۔ اکبر بھورانی جیسے لوگوں کو اشارا دے دیا گیا ہے۔ وہ ہیروئن چرس، کوکین وغیرہ قسم کی ادویات اب تمہارے ملک میں ہی خفیہ طور پر تیار کریں گے اور اتنے بڑے پیمانے پر تیار کریں گے کہ پورے ملک میں گویا ان کا سیلاب آ جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر

دوسرا آدمی ان کا عادی نظر آنے لگے گا۔ اس قسم کے پلانٹ لگانے کے لیے دوہرا کام کیا جائے گا۔ بڑے بڑے شہروں میں کارخانے خرید لیے جائیں گے، بھاری منافع دے کر۔ پھر ان کارخانوں میں دکھاوے کے طور پر تو عام مصنوعات تیار ہوں گی، وہ بھی ناقص قسم کی، لیکن درحقیقت ان میں نشہ آور ادویات تیار ہوا کریں گی اور پورے ملک میں پھیلائی جائیں گی۔"

"اور انتظامی ڈھانچہ کس طرح تباہ کیا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ان لوگوں کو انتہائی قیمتی چیزوں کے ذریعے خریدا جائے گا۔ ایسی چیزیں جو انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔"

"ہوں، تو یہ ارادے ہیں، لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے منصوبے شروع کرنے سے پہلے ہمیں قیدی بنانے کی کیوں سوجھی گئی۔ بھلا ان معاملات میں ہم کس طرح رکاوٹ بن سکتے تھے؟"

"تمہارے ملک میں بھی طرح کے لوگ ہیں۔ اگر ایک بھی سمجھدار فوجی ان فلموں کے اصل مقصد کو محسوس کر کے تمہیں یا کسی اور آفیسر کو اطلاع کر دیتا اور اس کے ذریعے تمہیں اطلاع ملتی تو تم متوجہ ہو سکتے تھے اور اصل منصوبے کی تہہ تک پہنچ جاتے اسی طرح دوسرے دو منصوبے بھی تمہارے علم میں آ سکتے تھے اور پھر تم معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ہمارے قید میں آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ابھی ملک میں انسپکٹر کامران مرزا ابھی موجود ہیں۔"

”ان لوگوں کو پکڑ کرلانے کا منصوبہ ترتیب دیا جا چکا ہے۔ آج کل میں وہ بھی آجائیں گے۔“

”اوہ، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، ہم واپس جا کر انہیں خبردار کردیں گے۔“

”لیکن مشکل یہ ہے کہ تم یہاں سے جا نہیں سکو گے۔ اس وقت تک اس مکان کو ملٹری والے پوری طرح گھیر چکے ہیں۔ میں غسل خانے کے دروازے میں لگے ایک خفیہ بٹن کے ذریعے انہیں خبردار کر چکا ہوں۔ اب تم بے شک مجھے گولی مار دو۔ میں نے تمہارے فرار کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”نہیں، تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔“ خان رحمان نے بھنا کر کہا۔

”یقین نہیں تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لو، ملٹری ہی ملٹری نظر آئے گی۔ تم ایک بار پھر میرے جال میں پھنس چکے ہو اور بے فکر رہو، اس مرتبہ میں تم لوگوں کو فرار نہیں ہونے دوں گا۔“

”ہمیں اگر گھیر لیا گیا تو کیا ہوا، تم بھی ہمارے نشانے کی زد میں ہو۔“ محمود نے منہ بنا کر کہا۔

”مجھے اپنی پروا نہیں، میں مر بھی گیا تو کیا، تم لوگوں کو تو مرتے مرتے بھی پھنسا گیا نا۔“

”محمود، کھڑکی سے جھانک کر دیکھو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود نے فوراً کھڑکی کی طرف قدم اٹھا دیے اور پھر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

”اف خدا، باہر تو پوری فوج موجود ہے۔“

”اچھا ٹھہرو، میں ان کا انتظام کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ اپنی جگہ سے

حرکت کی اور ڈی سائٹ کی کمر پر پہنچے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے دائیں ہاتھ کی ہڈی اس کی گدی پر لگی۔ وہ چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی اس کا کوٹ پہنا اور ہیٹ سر پر رکھ لیا، چشمہ آنکھوں پر لگا لیا اور کھڑکی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے چہرے کو ترچھا رکھتے ہوئے حلق سے ڈی سائٹ کی آواز نکالی:

”مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ صدر صاحب کے محل پر حملہ ہونے والا ہے۔ یہ حملہ دشمن ملک کے ایجنٹوں کی طرف سے کیا جائے گا، لہٰذا تم فوراً صدر صاحب کے محل کو گھیر لو۔ میری اجازت کے بغیر پرندہ بھی اندر پر نہ مار سکے۔ جب تک میں نہ پہنچوں، محل گھیرے میں رہے۔ بس روانہ ہو جاؤ۔“

ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی فوجی منتشر ہونے لگے اور انہوں نے کھڑکی بند کر دی۔

”اف اللہ، کتنی سادہ ترکیب سے کام چلا لیا آپ نے۔“ فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

”عقل سے بڑھ کر کوئی ہتھیار ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ مسکرائے۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”ڈی سائٹ کو بھی باندھ دو۔ ہم اسے ساتھ لے کر چلیں گے۔ اور اپنے ملک میں قیدی رکھیں گے۔“

”ویری گڈ، یہ ہوئی نا بات۔“ خان رحمان خوش ہو گئے۔

انہوں نے جلدی جلدی ڈی سائٹ کو باندھ دیا، پھر کھڑکی کھول کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔

”خان رحمان تم جا کر وین کو دروازے کے قریب لے آؤ۔ اس کا پچھلا حصہ دروازے سے لگا دینا، تاکہ ہم نہایت خاموشی سے ڈی سائٹ کو وین میں ڈال

دیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ تم اس پورے مکان کی جلدی جلدی تلاشی لے ڈالو۔ فائلیں، کاغذات اور اس قسم کی جتنی بھی اہم چیزیں مل سکیں، نکال لاؤ، شاید یہاں سام لٹ اور ڈی سائٹ کے سوا کوئی نہیں۔ یہ مکان دراصل ڈی سائٹ کا دفتر ہے، اس کا اپنا گھر نہیں، ورنہ یہاں دوسرے لوگ بھی ہوتے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ بھی حرکت میں آ گئے۔ آدھ گھنٹے بعد ان کی وین اڑی جا رہی تھی۔

"کیا اب ہم سرنگ کی طرف جا رہے ہیں ابا جان؟" فاروق نے پوچھا۔

"بھلا ہم سرنگ کی طرف کس طرح جا سکتے ہیں، جب کہ اس قید خانے کے قیدیوں سے وعدہ کر چکے ہیں کہ انہیں رہائی دلائیں گے۔ ہماری اس کامیابی میں دراصل ان قیدیوں کا بھی ہاتھ ہے۔"

"قیدیوں کا ہاتھ؟" فاروق بڑبڑایا۔

"ہاں، اگر وہ کھانے کے لیے شور مچا دیں تو نگران اندر داخل ہو کر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیں اور اس طرح انہیں ایک کوٹھری میں غوربان اور اس کے ساتھی بندھے ہوئے مل جائیں گے، لہٰذا ہم مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔ قیدی صرف ہماری وجہ سے خاموش ہیں اور ان کی اس خاموشی، یعنی مدد کا صلہ انہیں ضرور ملنا چاہیے۔ یوں بھی میں نے ان سے وعدہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر چلیے۔ پہلے قید خانے کی طرف ہی چلتے ہیں، لیکن ابا جان، میں اس موقعے پر ایک بات کہے بنا نہیں رہ سکتی۔" فرزانہ بولی۔

"ایک کیا، ایسے موقعوں پر تو تم کئی باتیں کہے بنا نہیں رہتیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور وہ یہ کہ اس وقت سرنگ کے دہانے پر کوئی نہیں ہوگا، کیونکہ فوجی جب

تک صدر کے محل تک نہیں پہنچ جاتے، اس وقت تک کسی کو گڑبڑ کا احساس نہیں ہوگا، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد شاید جلدی گڑبڑ کا پتا چل جائے گا اور اس صورت میں ہوگا یہ کہ فوجی سب سے پہلے سرنگ کے دہانے کا رخ کریں گے، کیونکہ وہ جانتے ہیں، ہم صرف اسی راستے سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

"زیادہ عقل مند بننے کی کوشش نہ کرو۔ بھلا فوجیوں کو محل تک پہنچتے ہی کس طرح گڑبڑ کا پتا چل جائے گا۔" محمود نے بھنا کر کہا۔

"صدر کو جب یہ اطلاع ملے گی کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے اور یہ کہ فوجیوں کو ان کی حفاظت کے لیے ڈی سائٹ نے بھیجا ہے تو پہلا کام وہ یہ کرے گا کہ فوراً ڈی سائٹ کو فون کرے گا، لیکن ڈی سائٹ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا، نہ سام لٹ فون کا ریسیور اٹھائے گا۔ فوری طور پر معلوم کرایا جائے گا کہ ڈی سائٹ اور سام لٹ کہاں ہیں یا انہیں کیا ہوا اور اس طرح گڑبڑ کا احساس ہو جائے گا۔ بس فوری طور پر سرنگ کی طرف فوجی روانہ کر دیے جائیں گے اور قید خانے کی طرف بھی۔ اس طرح ہم ایک بار پھر مشکل میں پھنس جائیں گے اور یہ صرف ان قیدیوں کی وجہ سے ہوگا۔ وہ قیدی اگر ہمارے ملک کے ہوتے تو اور بات تھی، لیکن وہ ادھر ادھر کے ملکوں کے ہیں، لہٰذا کیوں نہ ہم سیدھے سرنگ کی طرف چلیں۔"

"کیا تم ابا جان کو وعدہ خلاف بنانا چاہتی ہو؟" فاروق نے جھنجلا کر کہا۔

"ابا جان، آپ کیا کہتے ہیں؟" محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

"فرزانہ کے اندازے غلط نہیں۔ ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح ہو، لیکن اس کے باوجود میں ان قیدیوں کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ ہمیں ان سے بھی کام لینا پڑے گا۔"

"جی وہ کیسے؟ بھلا ہم ان قیدیوں سے کیا کام لیں گے؟" محمود بولا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ فی الحال تو قیدیوں کو رہا کرانے کا مسئلہ ہے۔"

آخر وین قید خانے کے سامنے رک گئی۔ اب انسپکٹر جمشید ڈی سائٹ کے لباس میں تھے اور ہیٹ چونکہ پیشانی پر بہت زیادہ جھکا ہوا تھا۔ اس لیے دور سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے لوہے کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

"چابیاں۔" وہ بولے۔

فوراً ہی چابیاں پیش کر دی گئیں۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی کوٹھڑی کھولنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر قیدیوں کو خاموش رہنے کا اشارا کر دیا تھا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگے۔ ایک ایک کر کے تمام کوٹھڑیاں کھل گئیں، بس غوربان والی بند رہنے دی گئی۔ وہ لوگ کوٹھڑی میں بری طرح لڑھکتے پھر رہے تھے۔

"باہر نکل کر اچانک محافظوں پر حملہ کرنا ہو گا۔ وہ بے خبری میں جلدی مارے جائیں گے۔ اس کے بعد قید خانے کے باہر کھڑی گاڑیوں پر قبضہ کر لینا اور ہماری وین کے تعاقب میں چلے آنا۔" انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں قیدیوں کو ہدایات دیں۔

"آپ فکر نہ کریں جناب، ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ ہم میں سے اکثر نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ انسپکٹر جمشید ہیں نا، مشہور و معروف سراغرساں۔"

"ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایک سیکنڈ قیمتی ہے۔" انہوں نے کہا اور لوہے کے دروازے پر تین بار انگلی سے ٹھک ٹھک کی اور پھر دھپ رسید کی۔ رائفلیں اب ان کے ہاتھوں میں تیار تھیں۔ جوں ہی دروازہ کھلا، انہوں نے فائر کھول دیا۔ قیدی بجز مار کر باہر نکلے اور بچے کھچے محافظوں پر ٹوٹ

پڑے۔ چند منٹ میں میدان صاف تھا۔ محافظوں کو کوٹھڑیوں میں بند کر کے تالے لگا دیے گئے اور گاڑیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہ قید خانہ شہر سے باہر تھا۔ شہری آبادی کا یہاں دور دور تک پتا نہیں تھا۔

اب ان کا قافلہ سرنگ کی طرف روانہ ہوا۔

"یہاں تک تو ٹھیک رہا۔ اب آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"کاش، ابھی تک کسی کو گڑبڑ کا احساس نہ ہوا ہو اور ہم سرنگ تک پہنچ جائیں۔" فرزانہ بولی۔

"سرنگ کے پاس پہنچنے کے بعد بھی مسئلہ تو حل نہیں ہو جائے گا۔ پہلا کام تو سرنگ کا دہانہ تلاش کرنا ہو گا اور اس کے بعد کھولنے کی ترکیب۔" فاروق نے کہا۔

"سرنگ کا دہانہ میں تلاش کر دوں گا، کھولنے کی ترکیب فرزانہ بتائے گی، کیونکہ ترکیبیں بتانا صرف اور صرف اس کا کام ہے۔" محمود نے کہا۔

"تم سرنگ کا دہانہ کس طرح تلاش کر دو گے؟" فاروق نے اسے گھورا۔

"جادو کے ذریعے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تو کیا تم ترکیبیں جادو کے ذریعے بتاتی ہو؟" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

ان کا سفر آدھ گھنٹے تک جاری رہا، پھر ان کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن میں انہوں نے پناہ لی تھی اور ہیلی کاپٹروں نے ان پر فائرنگ کی تھی اور ابھی وہ سرنگ کے دہانے سے کافی دور تھے کہ انسپکٹر جمشید نے وین روک دی۔ ان کے پیچھے دوسری گاڑیاں بھی رک گئیں۔

"کیا بات ہے ابا جان؟"

"ہم، میں۔ میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"خطرہ، لیکن یہاں تو دُور دُور تک خطرہ نظر نہیں آ رہا۔ یہاں تک کہ سرنگ کے نزدیک ایک فوجی بھی دکھائی نہیں دے رہا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اسی لیے تو میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" فرزانہ نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"فرزانہ، تم نے ہی تو کہا تھا کہ قیدیوں کو چھڑانے کی صورت میں ہمیں خطرات کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں دُور دُور تک کوئی فوجی نہیں ہے، آخر کیوں؟ فوجی محل تک پہنچ چکے ہوں گے تو کیا ... صاحب نے ڈی ای سائٹ کو فون کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔"

انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کے خیال میں تو یہ وقت آگے بڑھ جانے کا تھا۔ لیکن ان کے والد کہہ رہے تھے، پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔

"لیکن کیوں ابا جان، ہم کیوں پیچھے ہٹ جائیں۔ وقت تو آگے بڑھ کر سرنگ کا دہانہ تلاش کرنے اور اسے کھولنے کا طریقہ معلوم کرنے کا ہے، نہ کہ پیچھے ہٹنے کا۔" فرزانہ بے چین ہو گئی۔

"کیا تم یہ چاہتی ہو، ہم سب کے سب بھون ڈالے جائیں؟" انسپکٹر جمشید جھلا اٹھے۔

"نن نہیں تو، بھلا میں یہ کیوں چاہوں گی۔" وہ بوکھلا کر بولی۔

"تب پھر جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔" اور وہ گاڑیوں کو وہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ مڑ مڑ کر سرنگ کے دہانے کی سمت میں بھی دیکھ رہے تھے۔

"اگر سرنگ کا دہانہ ان پہاڑیوں میں کہیں ہے تو پیچھے ہٹنے کی کیا تک

ہے۔" ایک قیدی نے تلملا کر کہا۔

"اس وقت تم سب لوگوں کی کمان میرے ہاتھ میں ہے، لہٰذا جو میں کہوں، صرف وہ کرو۔"

"لیکن ہم دوبارہ اس ملک کے قیدی نہیں بننا چاہتے۔" وہی قیدی بولا۔

"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ بولے۔

"ہم ان پہاڑوں تک پہنچ کر سرنگ کا دہانہ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ دشمن کے فوجی کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس صورت میں بھی یہ پہاڑ ہمارے مددگار ثابت ہوں گے، کیونکہ کسی طرف سے ہم پر حملہ نہیں کیا جا سکے گا۔" قیدی نے کہا۔

"میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جمشید، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"چپ رہو خان رحمان۔" انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے اور خان رحمان سہم گئے۔ انسپکٹر جمشید نے آج تک ان سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد بھی بوکھلا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی وقت اس قیدی نے باقی قیدیوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"یہ صاحب وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں سرنگ کے دہانے کی تلاش میں جا رہا ہوں، تم میں سے کون کون میرا ساتھ دے گا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" ایک دوسرا قیدی بولا۔

"اور میں بھی۔"

تقریباً دس قیدی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ باقی شش و پنج کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔

"اب بھی وقت ہے، میری بات مان لو، آگے نہ بڑھو۔"

"تم نے ہمیں قید سے نجات دلائی ہے، تمہارا شکریہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تمہارے غلام بن کر رہ جائیں۔" قیدی نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ ان کے قدم تیز اٹھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کھیتوں سے آگے نکل گئے، پھر اچانک فائرنگ کی ہولناک آواز گونجی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔

☆☆☆

غلط سُرنگ

ان پر سکتے کی حالت طاری ہوگئی۔ ان کے ساتھ ٹھہر جانے والے قیدی تو کانپ اُٹھے۔

"اُف خدا، یہ کیا ہوا؟"

"یہی میرا خیال تھا کہ دشمن فوجی کھیتوں میں چھپے ہمارا انتظار کر رہے ہیں، تا کہ ہم سب اندھا دھند موت کے منہ میں جا گریں۔" انسپکٹر جمشید افسوس زدہ لہجے میں بولے۔

"اب کیا ہوگا جمشید؟" خان رحمان نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"ہوگا یہ کہ ہم اس طرف سے نہیں جا سکیں گے۔ اب یہ لوگ یہاں سے نہیں ہٹیں گے، بلکہ ہمیں ہوشیار پا کر سرنگ کے دہانے کی طرف چلے جائیں گے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تب پھر ہم کس طرف سے جائیں گے۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا، قیدیوں کو چھڑانے کے چکر میں ہمیں دیر ہو جائے گی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"لیکن میں ان لوگوں سے وعدہ کر چکا تھا۔ انہوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا تھا، پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہم ان کا خیال نہ کرتے۔"

"حیرت تو یہ ہے کہ یہ فوجی صرف سرنگ کی طرف جانے والوں کو کیوں نشانہ بنا رہے ہیں، وہ تو اس طرف رخ کر کے بھی فائرنگ کر سکتے ہیں، جہاں ہم کھڑے ہیں۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"ہماری بے بسی سے لطف اندوز ہو......اوہ، ہم تو ان لوگوں کا ناطقہ بند کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید چونک پڑے۔

"وہ۔وہ کیسے؟" محمود جلدی سے بولا۔

"ہمارے پاس دو قیدی ہیں۔ڈی سائٹ اور سام لٹ۔ہم ان کو آڑ بنا کر سرنگ کی طرف جا سکتے ہیں۔دشمن فوجیوں کو شاید اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔خان رحمان تین قیدیوں کو ساتھ لے کر وین تک جاؤ اور اس میں سے دونوں کا نکال لاؤ۔ جلدی کرو۔ابھی ہم کچھ بھی نہیں ہارے۔"

"ویری گڈ، یہ ہوئی نا بات۔" خان رحمان خوش ہو گئے۔

دو منٹ بعد ہی وہ ڈی سائٹ اور سام لٹ کو لے آئے۔

"مسٹر ڈی سائٹ، ان کھیتوں میں تمہارے فوجی موجود ہیں۔انہیں حکم دو کہ اسلحہ پھینک دیں اور فائر ہرگز نہ کریں، ورنہ ہم تمہیں بھون ڈالیں گے۔ان سے کہو، ہمیں سرنگ کے دہانے تک جانے دیں، کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔"

ڈی سائٹ سوچ میں ڈوب گیا، پھر زور سے چونکا اور خوش ہو کر بولا:

"ضرور ضرور، کیوں نہیں۔میں ابھی انہیں ہدایات دیتا ہوں۔"

وہ الجھن میں مبتلا ہو گئے۔نہ جانے ڈی سائٹ کس خیال پر چونکا تھا اور یکایک خوش کیوں ہو گیا تھا۔انہوں نے سُنا، وہ کہہ رہا تھا:

"لیکن تم لوگوں کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟" انہوں نے جلدی سے کہا۔

"تم لوگ مجھے اور سام لٹ کو ہلاک نہیں کرو گے۔"

"اگر تم نے کوئی چال نہ چلی، تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" وہ بولے۔

"تو ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں، کوئی چال نہیں چلوں گا اور تم لوگوں کو بخیریت جانے دیا جائے گا۔"

"تب پھر فوجیوں کو ہدایات دو، وقت بہت کم ہے۔"

"خبردار، میں ڈی سائٹ ان لوگوں کے ساتھ ہوں۔تم میں سے کوئی فائر نہ کرے، بلکہ تم اپنا اسلحہ پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کر کھیتوں سے باہر نکل آؤ۔" یہ الفاظ اس نے بلند آواز میں کہے۔

لیکن اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی گئی۔

"یہ کیا، تم لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔میں کہتا ہوں اسلحہ پھینک دو۔"

"ہم تمہاری چال میں آنے والے نہیں۔ہم جانتے ہیں، تم انسپکٹر جمشید ہو اور مسٹر ڈی سائٹ کے میک اپ میں ہو۔ان کی آواز کی کامیاب نقل اتار رہے ہو۔"

"تم لوگ عقل کے اندھے ہو، تمہارا لیڈر جو کوئی بھی ہے، نزدیک آ کر دیکھ لے۔ان لوگوں کے ساتھ واقعی میں کھڑا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں، لیکن اگر مجھ پر فائرنگ کی گئی تو ہم بھی اندھا دھند فائر کھول دیں گے۔" ایک آواز سنائی دی۔

اور پھر ایک لمبے قد کا آدمی کھیتوں سے نکل کر سامنے آ گیا۔اس نے ڈی سائٹ کی شکل سے ملتے جلتے دو آدمی دیکھے تو چکرا گیا۔

"آپ میں مسٹر ڈی سائٹ کون ہیں؟"

"یہ میں ہوں احمق۔یہ شخص انسپکٹر جمشید ہے۔انہوں نے رائفلیں مجھ پر

تان رکھی ہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں، کرو، ورنہ تم لوگوں کا حشر بہت برا ہوگا۔"

"ابھی لیجیے جناب۔" اس نے کانپ کر کہا، پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا:

"سب لوگ ہتھیار ڈال دیں اور ہاتھ اوپر اٹھائے باہر آجائیں۔" فوراً تعمیل کی گئی۔

"ہم لوگ مسٹر ڈی سائٹ اور سام لٹ کو لیے سرنگ کے دہانے کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے کوئی شرارت نہ کی تو یہ دونوں زندہ سلامت تمہارے پاس آجائیں گے، ورنہ ہم ان کی زندگیوں کی ضمانت نہیں دے سکتے۔"

"خبردار، تم میں سے کوئی غلط حرکت نہ کرے۔"

"او کے سر، آپ فکر نہ کریں۔" کیپٹن نے کہا۔

اور وہ ایک ایک قدم اٹھاتے آگے بڑھے۔ سام لٹ اور ڈی سائٹ کو انہوں نے اپنے آگے رکھا ہوا تھا اور رائفلوں کی سنگینیں ان کی کمروں کو چھو رہی تھیں۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر انہیں ان دونوں کو بائیں ہاتھ لے لینا پڑا۔ وہ ان دونوں کو اپنے اور دشمن فوجیوں کے درمیان میں رکھنا چاہتے تھے۔

آخر وہ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں ان کے خیال میں سرنگ کا دہانہ تھا۔

"شکریہ مسٹر ڈی سائٹ، اب مہربانی فرما کر سرنگ کا دہانہ بھی کھول دیں۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور نہ جانے کیا کیا کہ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ پتھر سرک گیا اور سرنگ نظر آنے لگی۔

"اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"پہلے تم۔ اپنے آدمیوں کو حکم دو، وہ گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو جائیں اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھیں، جب انہیں روانہ ہوئے پندرہ منٹ گزر جائیں

گے۔ اس وقت ہم تم دونوں کو جانے کی اجازت دے دیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم لوگ سرنگ کے دہانے پر کھڑے ہو، اندر داخل ہو جاؤ اور سرنگ بند کر لو۔" ڈی سائٹ نے کہا۔

"لیکن اس طرح تم ہماری گرفت سے آزاد ہو جاؤ گے اور فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دو گے کہ سرنگ کا دہانہ کھول کر ہم پر حملہ کر دیں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے، تم واقعی بہت چالاک ہو۔ اچھا ٹھہرو، میں انہیں حکم دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ منہ کے گرد رکھے اور بلند آواز میں بولا:

"تم لوگ اپنا اسلحہ اسی حالت میں چھوڑ کر گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ خبردار پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔"

اس حکم کے فوراً بعد فوجیوں نے گاڑیوں کا رخ کیا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیاں روانہ ہو گئیں، پھر تقریباً دس منٹ گزر گئے تو ڈی سائٹ نے کہا:

"میرا خیال ہے، اب تو تمہارا اطمینان ہو گیا ہوگا۔"

"ہاں، اب تم دونوں بھی جا سکتے ہو، لیکن نہیں، ہم تم دونوں کے ہاتھ کر کے پیچھے باندھ کر یہاں سے جانے کی اجازت دیں گے۔ چلو بھئی باندھ دو ان کے ہاتھ کمر پر۔"

"ایک منٹ ابا جان۔" اچانک محمود بول اٹھا۔ انہوں نے چونک کر محمود کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے محمود؟"

"ہم اس سرنگ سے نہیں جائیں گے۔" محمود نے کہا اور ڈی سائٹ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''ہم اس سرنگ سے جائیں گے، جس سے آئے تھے اور یہ وہ سرنگ نہیں ہے۔''

''کیا؟'' ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ڈی سائٹ کا منہ بھی مارے حیرت کے کھل گیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو محمود، یہ وہ سرنگ نہیں ہے؟'' انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں، آپ کو یاد ہے، سرنگ سے نکلنے کے بعد میں گر پڑا تھا اور آپ نے مجھے اٹھایا تھا۔''

''ہاں یاد ہے، پھر.....''

''پھر یہ کہ میں اپنا چاقو نکالنے کے لیے گرا تھا اور چاقو سے میں نے پتھریلی زمین پر ایک نشان بنایا تھا۔ وہ سرنگ دراصل اس نشان کے سامنے ہے۔''

''اوہ۔'' وہ حیران رہ گئے۔

''تت تو۔ کیا یہ غلط سرنگ ہے؟'' خان رحمان بڑبڑائے۔

''جی ہاں، یہ ضرور دھوکے کی ٹٹی ہے۔''

''کیوں مسٹر ڈی سائٹ، میرا بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''ہاں، میں نے تم لوگوں کی ذہانت کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ تم لوگ بلاوجہ مشہور نہیں ہو۔ واقعی یہ وہ سرنگ نہیں ہے۔ یہ تو ایک قسم کا قید خانہ ہے۔ خیر، میں اسے بند کیے دیتا ہوں اور وہ سرنگ کھول دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ کر دہانہ بند کر دیا۔ ساتھ ہی ایک دوسرا دہانہ کھل گیا۔

''اب تم سرنگ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بھی بتاؤ، تاکہ ہم سرنگ کے

اندر پہنچ کر دہانہ بند بھی کر سکیں اور قصبہ جالوم والی سمت میں پہنچ کر کھول بھی سکیں۔''

''آؤ میں بتاؤں۔''

''ہوشیار رہنا، صرف میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ سام لٹ، تم یہیں کھڑے رہو گے۔''

''اچھا۔'' سام لٹ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''ڈی سائٹ انہیں لے کر آگے بڑھ گیا۔

''یہ دیکھیے گول پتھر۔ اس پر پورا ہاتھ رکھ کر گھمائیں تو دہانہ کھل جائے گا۔ اندر پہنچ کر جب اسی قسم کے گول پتھر کو الٹا گھمائیں گے تو دہانہ بند ہو جائے گا۔ اس پر ہلکا سا دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے، زور نہیں لگانا پڑتا۔''

''شکریہ، پہلے صرف میں اندر جا کر دہانہ بند کر کے دیکھوں گا اور جب اطمینان ہو جائے گا ہم تم دونوں کو جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

''بہت محتاط ہو۔ اچھا یوں ہی سہی۔'' اس نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

انسپکٹر جمشید اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا، دائیں طرف گول پتھر موجود تھا۔ اسے الٹا گھمایا تو دہانہ بند ہو گیا۔ سیدھا گھمایا تو پھر کھل گیا۔

''ٹھیک ہے مسٹر ڈی سائٹ، اب تم دونوں جا سکتے ہو۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا، ورنہ.....''

''ورنہ پتھر کے بن جائیں گے۔'' فاروق بول اٹھا اور وہ مسکرا دیے۔

دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے کھیتوں کی طرف جانے لگے۔

''جمشید کھیتوں کے قریب اسلحہ پڑا ہے۔ یہ دونوں رائفلیں اٹھا کر ہم پر فائرنگ کر سکتے ہیں۔'' خان رحمان نے گویا خبردار کیا۔

"فکر نہ کرو، اس سے پہلے ہم انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیں گے۔"

"لیکن ان دونوں نے رائفلیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ کھیتوں سے گزر کر آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"اب ہم کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔ بس میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ہم اتنی آسانی سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"نظر تو یہی آتا ہے۔ ڈر ہے تو صرف یہ کہ کہیں اس میں ڈی سائٹ کی کوئی چال نہ ہو۔"

"آؤ، فی الحال تو کسی چال کا امکان نظر نہیں آتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اور پھر سب سرنگ میں داخل ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید نے گول پتھر گھما کر دہانہ بند کر دیا۔ سرنگ میں روشنی ہو گئی۔

"اب جس قدر تیز دوڑ سکتے ہو دوڑو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب، اب دوڑنے کی کیا ضرورت؟" پروفیسر داؤد گھبرا کر بولے۔

"ڈی سائٹ اور سام لٹ جونہی محفوظ جگہ پہنچیں گے، فوجیوں کو واپس آ کر سرنگ پر حملے کا حکم دیں گے۔ اب اگر ایک پوری فوج سرنگ کا دہانہ کھول کر ہم پر حملہ کر دے تو ہم کیا کر سکیں گے۔"

"تو کیوں نہ دہانہ کھلنے اور بند ہونے کا نظام خراب کر دیا جائے، تا کہ وہ باہر سے اندر داخل ہی نہ ہو سکیں۔"

"اس میں دیر لگ سکتی ہے اور اس طرح ہم بھی خطرہ مول لیں گے۔" وہ بولے۔

"گویا ہمیں دوڑنا ہی ہوگا۔"

"ہاں بالکل، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" انہوں نے کہا اور سب نے دوڑ لگا دی۔

"جج، جمشید، میں کیا کروں۔" پروفیسر داؤد بوکھلا اٹھے۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

"واہ، کتنا اچھا نسخہ ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا اسی وقت انسپکٹر جمشید نے جھک کر انہیں اپنے کندھے پر ڈال لیا اور دوڑنے لگے۔ اب وہ سب دوڑ رہے تھے۔ سرنگ کم لمبی نہیں تھی۔ دوڑ کر بھی اسے جلد عبور نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد فرزانہ چلائی:

"ابا جان، دشمن سرنگ میں داخل ہو چکے ہیں اور وہ بھی دوڑ رہے ہیں۔"

"اوہ، اب ہمیں اور تیز دوڑنا ہوگا۔ اگرچہ درمیانی فاصلہ آدھ گھنٹے کا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم رفتار کم کر دیں۔ ابھی تو شکر ہے کہ انہوں نے ہم تک آنے کے لیے موٹر سائیکلیں استعمال نہیں کیں۔ اس سرنگ میں موٹر سائیکلیں تو استعمال کی ہی جا سکتی تھیں۔ شاید ان لوگوں کی بھی عقلیں ماری گئی ہیں۔"

وہ اور تیز دوڑنے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے سرنگ کا دوسرا سرا نظر آنے لگا۔ ان کی رفتار کم ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے پروفیسر صاحب کو نیچے اتار دیا اور بولے:

"میں سرنگ کا دہانہ کھول دوں۔"

"ٹھ ٹھیک ہے۔" وہ ہکلائے۔

انسپکٹر جمشید دہانے کے قریب پہنچے۔ دائیں طرف انہوں نے گول پتھر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، لیکن یہاں کوئی گول پتھر نہیں تھا۔ اب انہوں نے بائیں طرف دیکھا، لیکن ادھر بھی کوئی گول پتھر نہیں تھا۔

"اف خدا، یہاں تو کوئی گول پتھر نہیں ہے۔" انہوں نے کانپ کر کہا۔

"کک، کیا مطلب؟" کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ کہ یہ دہانہ کسی اور طرح کھلتا ہے۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی انہوں نے دوڑتے قدموں کی آواز نزدیک آتے محسوس کی۔

ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

مارشل لاء

چند لمحے تک کوئی کچھ نہ بولا۔ آخر فاروق کی آواز سنائی دی:

"تو کیا اب ہمیں اس سرنگ میں لڑائی لڑنا ہو گی؟"

"ہاں، ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، لیکن اس لڑائی میں ہم ہر صورت میں نقصان میں رہیں گے۔ نہ تو ہم پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس اسلحہ نہ ہونے کے برابر ہے، گولیاں کب تک چلیں گی، جب کہ دشمن ہر طرح لیس ہے۔ ان کے لیے ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔" خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہمت ہار دیں۔ خدا پر بھروسا نہ کریں۔ خان رحمان مورچے سنبھال لو۔ میرا مطلب ہے، رائفلیں سنبھال کر سینے کے بل لیٹ جاؤ اور دشمن کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاؤ، کچھ بھی ہو، ہم بہادری کی موت مریں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جمشید، تم بھی ان کا ساتھ دو۔ دہانہ میرے حوالے کر دو میں اسے کھولنے کا طریقہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے، آیئے۔" انہوں نے کہا اور باقی لوگوں کے ساتھ آ ملے۔ سب کے سب سینے کے بل لیٹ گئے اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ بس پروفیسر داؤد کھڑے رہ گئے۔ وہ دہانے کے دائیں بائیں، اوپر نیچے اور ہر طرف ہاتھ

پھیر رہے تھے۔ جگہ جگہ دباؤ ڈال رہے تھے۔ ادھر دوڑتے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"دشمن بہت نزدیک آ گیا ہے، ہوشیار ہو جاؤ، ہماری کوئی گولی خالی نہ جائے۔"

"فکر نہ کریں ابا جان، ہم ان کے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوں گے۔" فرزانہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"پروفیسر صاحب، خطرہ سر پر آ پہنچا۔ اب آپ بھی لیٹ جائیں۔"

انسپکٹر جمشید کو ان کا خیال آیا۔

"میں کیسے لیٹ سکتا ہوں۔ اگر میں لیٹ گیا تو پھر ہم سب ہی لیٹے رہ جائیں گے۔ سرنگ کا دہانہ کھلنے کی صورت میں ہی ہم بچ سکتے ہیں۔"

"آپ کی بات بھی ٹھیک ہے، لیکن کھڑے رہنے کی صورت میں آپ شدید خطرے کی زد میں ہوں گے۔"

"اب ہم بھی شدید خطرے میں گھر چکے ہیں جمشید، میری فکر چھوڑو، دشمنوں کو نشانہ بنانے کی تیاری کرو۔" انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

"اچھا، چلیے آپ کی مرضی۔ خان رحمان میرے بچو، مجھے افسوس ہے، میں اس مرحلے پر تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ کاش ہم اس سرنگ میں داخل نہ ہوتے۔ ہم کسی اور راستے سے اپنے ملک پہنچ سکتے تھے۔ وہ راستہ خطرناک تو ضرور ہوتا، لیکن ہم میں سے کچھ ضرور بچ جاتے۔" انہوں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"ابا جان، خدا کے لیے مایوسانہ باتیں نہ کریں۔ اس طرح ہمیں اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں، جمشید، اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ مسلمان کو موت سے کیا ڈر۔"

خان رحمان بولے۔

ساتھ ہی انہوں نے دور بہت دور سرنگ میں دشمنوں کو دوڑ کر آتے دیکھ لیا۔

"دشمن آ پہنچا، فائر۔" خان رحمان بولے۔

انہوں نے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ بھاگتے دشمن منہ کے بل گرے اور ان کے پیچھے آنے والے ان پر گرے۔ ان کی چیخیں سرنگ میں حد درجے عجیب لگیں۔ شاید اس لیے بھی کہ اس سے پہلے انہوں نے سرنگ میں کبھی جنگ نہیں لڑی تھی۔ دشمن نے دم سادھ لیا۔ شاید انہیں یہ امید نہیں تھی کہ ان کا مقابلہ اس درجے دلیری سے کیا جائے گا۔ وہ تو یہ خیال کیے بیٹھے تھے کہ ان کی کثیر تعداد اور بند سرنگ دیکھ کر یہ لوگ خود کو ان کے حوالے کر دیں گے۔

اب وہ بھی سب کے سب پیٹ کے بل لیٹ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر کھڑے ہوئے پروفیسر داؤد پر پڑی۔ ان میں سے ایک نے لیٹے لیٹے ان کا نشانہ لیا، لیکن اسی وقت انسپکٹر جمشید کی رائفل سے نکلنے والی گولی اسے چاٹ گئی۔ پروفیسر داؤد تو ادھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ وہ تو بس سرنگ کا دہانہ کھولنے کی فکر میں تھے۔

"آگے بڑھو، رک کیوں گئے۔ تم ان چند آدمیوں سے ڈر گئے۔" دشمن کی طرف سے شاید ان کے کمانڈر نے کہا۔

ایسا لگا، جیسے وہ یک دم ہوش میں آ گئے ہوں۔ ان کی رائفلیں سیدھی ہو گئیں، لیکن عین اسی وقت ادھر سے باڑھ ماری گئی۔ ایک بار پھر چیخیں گونج اٹھیں۔ ساتھ ہی دشمن نے بھی فائر کھول دیا۔

پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے انہیں لرزا کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی

انہوں نے ان کی آواز سُنی:

"مم، میں۔ جمشید۔ میں نے۔"

اور ان کی آواز ڈوب گئی۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا ان کے جسموں سے ٹکرایا۔ مڑ کر جو دیکھا تو دہانہ کھلا تھا۔

☆☆

وہ اندھا دھند اُٹھے اور دہانے کی طرف دوڑ پڑے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کو سب سے زیادہ فکر پروفیسر داؤد کا تھا۔ ان کے گولی لگ چکی تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں پیروں میں کچلے جانے کے لیے پیچھے پڑا رہنے دیا جائے، لہٰذا انہوں نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ان تک پہنچ گئے۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے انہیں بائیں کندھے پر ڈال لیا۔ اس وقت تک قید خانے سے ساتھ آنے والے قیدی سرنگ سے باہر چھلانگیں لگا چکے تھے۔

دوسرے ہی لمحے ان کی چیخوں نے فضا کو تھرا کر رکھ دیا۔ اس وقت تک وہ بھی سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے فوراً خود کو گرا دیا اور رینگ کر سرنگ سے نکل آئے۔

"باہر بھی دشمن موجود ہے خان رحمان اور سرنگ کے اندر بھی۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اور باہر یقیناً اکبر بھورانی کے ساتھی موجود ہیں۔ ڈی سائٹ نے پہلا کام اکبر بھورانی کو فون کرنے کا کیا ہوگا۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔"

وہ رینگتے ہوئے دائیں طرف مڑ گئے۔ دونوں طرف کے دشمنوں سے بچنے کا بس یہی طریقہ تھا۔ انسپکٹر جمشید جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتے تھے، کیونکہ

انہوں نے محسوس کر لیا تھا۔ پروفیسر داؤد ابھی زندہ ہیں اور انہیں فسٹ ایڈ کی ضرورت تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی انہوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی اور ڈی سائٹ کے فوجی دہانے پر نمودار ہوئے، لیکن گولیوں کی بوچھاڑ نے ان کے پرخچے اڑا دیے۔ اکبر بھورانی کے ساتھیوں نے ڈی سائٹ کے فوجیوں کو نشانہ بنا ڈالا تھا۔ اب انہیں کیا معلوم تھا کہ اندر دونوں گروہ نزدیک آ گئے تھے۔

"خان رحمان، موقع اچھا ہے۔ صورت حال دلچسپ ہو گئی ہے۔ ہم موقعے سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے دُور نکل سکتے ہیں۔ ڈی سائٹ نے اکبر بھورانی کو فون پر بھی بتا دیا ہوگا کہ ہم لوگوں کے ساتھ بہت سے قیدی بھی فرار ہو گئے ہیں۔ تم لوگ یہ جان کر خوش ہو گے کہ پروفیسر داؤد زندہ ہیں اور میرا خیال ہے، زیادہ زخمی بھی نہیں ہیں۔"

"شکر ہے خدا کا۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

"اور اکبر بھورانی کے آدمی سرنگ سے نکلنے والوں کو قیدی ہی خیال کر رہے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

وہ رینگتے ہوئے اس جگہ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ سرنگ کے پاس ابھی تک فائرنگ ہو رہی تھی اور اس فائرنگ پر وہ بار بار مسکرا رہے تھے۔ فاروق کے تو ہر بار دانت نکلے پڑ رہے تھے۔

"بھئی، اب اتنے بھی دانت نہ نکالو، کہیں باہر ہی نہ گر پڑیں۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"میرے دانت مصنوعی نہیں ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تب خدا کا شکر ادا کرو۔" محمود ہنسا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے مصنوعی دانت عطا نہیں کیے۔" فاروق بولا اور وہ مسکرانے لگے۔ گولیوں کی آواز اب لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ یعنی وہ سرنگ سے بہت دور نکل آئے تھے۔

اب انہوں نے پروفیسر داؤد کو لٹا کر دیکھا۔ ان کے دائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی بازو پر رومال وغیرہ باندھ دیا اور پھر چلنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ بعد پروفیسر داؤد نے آنکھیں کھول دیں۔

"جمشید، میں زندہ ہوں؟"

"آپ سو فیصد زندہ ہیں۔ معمولی سے زخم آئے ہیں۔"

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

"لیکن آپ نے دہانہ کس طرح کھول لیا؟"

"دو انچ قطر کا ایک گڑھا نظر آیا تھا۔ میں نے اس میں ہاتھ ڈال کر دباؤ ڈالا ہی تھا کہ گولی میرے بازو میں لگی اور میں گر گیا، تو کیا دہانہ کھل گیا تھا؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں، آپ کی چیخ سن کر ہم نے آپ کی طرف دیکھا تو دہانہ کھلا نظر آیا۔" خان رحمان بولے۔

"چلو شکر ہے، مجھے اپنے زخمی ہونے کا کوئی افسوس نہیں۔" پروفیسر داؤد خوش ہو گئے۔

"میں چاہتا ہوں، جلد از جلد قصبے میں پہنچ کر آپ کو ہسپتال میں داخل کرا دوں۔ اس کے بعد ان لوگوں کی طرف توجہ دوں۔"

"تو کیا تم ان لوگوں کو یہیں لڑتے بھڑتے چھوڑ جاؤ گے؟" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

"اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت مناسب بھی یہی ہے۔ انہیں آپس میں ہی لڑنے دیا جائے۔ آپ کو ہسپتال میں چھوڑ کر ہم فوج کی مدد حاصل کریں گے۔" انہوں نے کہا۔

نہ جانے انہیں کب تک پیدل چلنا پڑا۔ آخر خدا خدا کر کے ایک ٹیکسی ملی اور وہ اس میں لد پھند کر ہسپتال پہنچے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اعتراض بھی کیا کہ اس کا چالان ہو جائے گا، لیکن انہوں نے چالان کی ذمے داری اپنے سر لی۔ اس وقت پروفیسر داؤد کے زخم کا نازک مسئلہ درپیش تھا، ایسے میں وہ چالان کی کیا پروا کرتے۔ ان کے بازو سے خون کا بہنا بند نہیں ہو سکا تھا۔ انہیں ڈاکٹروں کے حوالے کر کے وہ اسی وقت سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیپٹن ارشاد نے انہیں دیکھ کر حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں، پھر بولا:

"معلوم ہوتا ہے، آپ تمام کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں۔"

"نہیں کیپٹن صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو ذرا دشمن ملک تک ہو کر آ رہے ہیں۔"

"جی، کیا فرمایا۔ دشمن ملک تک؟" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

"ہاں، آپ کے جانے کے بعد ہم پر بھی افتاد آ پڑی تھی۔" انہوں نے کہا اور تفصیل سنا دی۔ کیپٹن ارشاد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اف خدا، یہ میں کیا سن رہا ہوں۔"

"وہی جو حقیقت ہے۔ ہم نے آپ کو کسی مہماتی ناول کا کوئی حصہ پڑھ کر نہیں سنایا۔" فاروق بولا اور خان رحمان مسکرا دیے۔

"پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"آپ اپنے دستے کو لے کر ہمارے ساتھ چلیے۔ لیکن اس سے پہلے اپنے

آفیسر کو تمام حالات سنا دیجیے۔ تاکہ وہ فوری طور پر اس سرحد پر بھاری تعداد لے آئیں۔ کیا خبر دشمن ملک جھلاہٹ میں حملہ ہی کر دے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور فون کرنے چلا گیا۔ دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"فون کر دیا ہے۔ ابھی سب انتظامات ہو جائیں گے۔ ہم آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔"

"شکریہ۔" انہوں نے کہا اور پھر فوج کے دستے کے ساتھ وہ پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں اب مکمل طور پر خاموشی طاری تھی۔ سرنگ کے دہانے کے قریب اور ادھر ادھر لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سرنگ کا دہانہ کھول کر دیکھا گیا۔ اندر بھی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

"اس سرنگ کو بھی بند کرنا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"فکر نہ کیجیے۔ سب سے پہلا کام ہی یہ کیا جائے گا۔ بریگیڈیئر صاحب خود تشریف لا رہے ہیں۔ وہ یہ کام اپنی نگرانی میں کرائیں گے۔"

"اس کے علاوہ ایک اور بہت ضروری کام کرنا ہے۔ بریگیڈیر صاحب آئیں تو میں انہیں تفصیلات بتا دوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ کیا کام ہے؟" کیپٹن ارشاد نے پوچھا۔

"اس قصبے پر مارشل لاء نافذ کرنا ہوگا۔ لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا ہوگی کہ اکبر بھورانی اس قصبے کا حاکم ہے۔"

"اوہ ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔" اس نے کہا۔

دو گھنٹے بعد بریگیڈیر صاحب پہنچے۔ وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں مبارک باد دی کہ دشمن ملک سے بچ کر نکل آئے تھے۔ انہوں نے تمام تفصیلات

آپس میں بیٹھ کر طے کیں..... طے یہ پایا کہ مارشل لاء مہینے کی آخری تاریخ کو لگایا جائے گا۔ یعنی اکبر بھورانی کے اجلاس کے بعد۔

☆☆☆

مصرعہ

دو دن انہوں نے ایک ہوٹل میں گزارے۔ ان کا زیادہ وقت ہسپتال میں کٹا۔ پروفیسر داؤد اب بہت بہتر تھے۔ اس دوران محمود، فاروق اور فرزانہ شدید الجھن کا شکار رہے۔ انہوں نے کئی بار اکبر بھورانی کے بارے میں پوچھا۔

"ابا جان، ان تمام حالات کے بعد بھلا اکبر بھورانی وقار منزل میں اجلاس کیوں طلب کرنے لگا۔"

"اگر وہ وقار منزل میں اجلاس نہیں بلائے گا تو کہیں اور بلائے گا، بلائے گا ضرور۔"

"لیکن ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ اجلاس کہاں ہو رہا ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"یہ کیا مشکل ہے۔ نوردین موچی، سارم وغیرہ یہاں موجود ہیں۔ یہ لوگ اکبر بھورانی کے خاص آدمی ہیں۔ اجلاس میں ضرور شرکت کریں گے۔ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے اجلاس کی جگہ تک پہنچ سکتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اور اگر ان لوگوں کو حالات کی نزاکت کی وجہ سے نہ بلایا گیا تو۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"تب بھی ہم اجلاس کی جگہ ضرور معلوم کر لیں گے۔ میری نظروں میں کچھ اور لوگ بھی ہیں، جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اکبر بھورانی گروہ کے آدمی

ہیں۔"

"اور وہ کون لوگ ہیں، کیونکہ عرفان غازی مارا جا چکا ہے اور کوئی آدمی ہمیں ایسا نظر نہیں آتا۔" محمود نے الجھ کر کہا۔

"تمہیں چاہیے، آنکھیں کھلی رکھا کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن اس کیس کے دوران ہمیں آنکھیں بند کرنے کا موقع ہی کہاں ملا ہے ابا جان۔" فاروق بولا۔

"آج دس بجے ہمیں اجلاس کی جگہ پہنچنا ہے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ کیس کے دوران تم سوتے رہے ہو یا جاگتے۔" انہوں نے پراسرار لہجے میں کہا۔

"آپ تو ہمیں اور بھی الجھن میں مبتلا کر رہے ہیں۔" فاروق نے بے چین ہو کر کہا۔

"تم ہی کیا، میں بھی الجھن کا شکار ہو کر رہ گیا ہوں۔" خان رحمان بولے اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

ساڑھے نو بجے کے قریب وہ اپنے ہوٹل سے نکلے۔ اسی وقت ان کی نظر ایک جانے پہچانے آدمی پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا، جس کی ٹیکسی میں سفر کر چکے تھے۔ جس کے ساتھ ان کی کافی دیر تک بات چیت ہوئی تھی۔

"ہاں بھئی، کیا حال ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"او ہو، یہ آپ لوگ ہیں۔ خدا کا شکر ہے، فرمایئے کہاں کا ارادہ ہے؟"

"بس ذرا ایک دو جگہ جائیں گے۔"

"یہ ری ٹیکسی حاضر ہے۔"

"شکریہ، اسی لیے تو ادھر آئے ہیں۔" انہوں نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ

گئے۔

''ہم آپ کا نام پوچھنا بھول گئے تھے۔ نام بتانا پسند کریں گے۔''

''کیوں نہیں، اس میں کیا حرج ہے۔ مجھے عادل کہتے ہیں۔''

''آپ نے بتایا تھا، آپ کو اکبر بھورانی سے نفرت ہے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔''

''تو پھر آج ہم اکبر بھورانی کا جھگڑا اس قصبے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے جا رہے ہیں۔ شاید آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی۔''

''اوہو، یہ تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے، پھر تو مجھے بھی اپنے ساتھ رکھیں۔''

''بھئی یہ مشکل ہے، کیونکہ یہ کام جان جوکھوں کا ہے۔''

''پھر کیا ہوا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''خیر، جیسے تمہاری مرضی۔'' انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

''نوردین موچی کے گھر چلنا ہے، لیکن ٹیکسی کچھ دور ہی روک لینا۔ ہم ذرا دور رہ کر جائزہ لیں گے۔''

''اچھا۔'' اس نے کہا اور ٹیکسی چلا دی۔

پندرہ منٹ بعد وہ نوردین موچی کے گھر کے سامنے موجود تھے۔

''مسٹر عادل، آپ کو ایک تکلیف دوں گا۔ ذرا کسی پبلک فون بوتھ سے نوردین موچی کو فون تو کریں۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ گھر میں ہے یا نہیں۔''

''لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دستک دے کر بھی تو یہ بات معلوم کر سکتے ہیں۔''

''نہیں بھئی، ہمیں ذرا پردے میں رہنا ہے۔''

''جی بہتر، میں ابھی فون کر کے آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور ٹیکسی سے اتر کر چلا گیا۔

''آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟'' محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میرا خیال تھا، اجلاس وقار منزل کی بجائے نوردین موچی کے گھر میں ہوگا، لیکن یہاں تو لوگوں کی آمد و رفت کے کوئی آثار نہیں ہیں۔'' انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

''پھر اب کیا ہوگا؟''

''کوئی بات نہیں۔ ہم اجلاس کی جگہ تلاش کر لیں گے۔'' وہ بولے۔

تین منٹ بعد عادل واپس آتا نظر آیا۔ آتے ہی بولا:

''وہ گھر میں نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔ آپ کو وقار منزل کے بارے میں معلوم ہے؟''

''ہاں، ہے تو سہی۔''

''کیا یہ عمارت کسی وقار نامی آدمی کی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ ہو سکتا ہے، کسی زمانے میں رہی ہو۔ اب تو وہ عمارت ہوٹل گنار کے مالک ساروم کی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ۔'' ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''تب تو آپ وقار منزل ہی چلیں۔ اجلاس ضرور وہیں ہوگا۔ اکبر بھورانی اب تک اس خوش فہمی میں ہوگا کہ قصبے میں حکم تو اسی کا چلتا ہے، ہم لوگ بھلا اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔''

''ضرور یہی بات ہے ابا جان۔'' فرزانہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، اب ہم وہیں چلیں گے۔"

"بیس منٹ بعد عادل نے انہیں وقار منزل کے پاس پہنچا دیا۔ یہ شہری آبادی سے الگ تھلگ عمارت تھی۔ اس کے چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ مکان کے ارد گرد کاریں ہی کاریں کھڑی تھیں۔ کاروں کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید بولے:

"بس ٹھیک ہے، انہوں نے اجلاس کی جگہ تبدیل نہیں کی۔ بہت دلیر لوگ ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

"آپ ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"بریگیڈیئر صاحب کو دیکھ رہا ہوں۔ انہیں اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"تو کیا وہ پہلے نورین موچی کے گھر کی طرف نہیں جائیں گے؟"

"کیپٹن ارشاد اکیلا جا کر جائزہ لے گا اور بریگیڈیئر صاحب کو اطلاع دے گا۔ اس صورت میں بھی انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ خیر، آتے رہیں گے۔ اب ہم اور نہیں رک سکتے۔ آؤ بھئی چلیں۔"

وہ آگے بڑھے۔ عمارت کے دروازے پر کوئی نگران نہیں تھا۔ دروازہ اندر سے بند ملا، چنانچہ وہ چکر لگا کر پچھلی طرف پہنچے۔ کئی درخت عمارت کی منڈیر کو چھو رہے تھے۔

"فاروق کو ہی نہیں، ہم سب کو اسی طرف سے جانا ہوگا، تاہم ہم بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیں گے تاکہ بریگیڈیئر صاحب کو وقت نہ ہو۔"

"چلو بھئی محمود، آج صرف مجھے درخت پر نہیں چڑھنا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اس ضرب المثل کا یہاں کیا موقع؟" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"میرا مطلب ہے....." فرزانہ نے کہنا چاہا، لیکن انسپکٹر جمشید نے ڈانٹ دیا۔

"بس بس، ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔"

"اوہ، ہمیں افسوس ہے ابا جان۔" فرزانہ نے سہم کر کہا اور سب لوگ درخت پر چڑھنے لگے۔

جب سب لوگ چھت پر پہنچ گئے تو زینے کا رخ کیا گیا۔ زینے کا دروازہ بند نہیں ملا۔ یہ دیکھ کر محمود ٹھٹک گیا۔

"کہیں ہم لوگوں کے لیے جال تو نہیں بچھا دیا گیا، کیونکہ یہ بات تو ان لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے کہ ہم ان کی قید سے نکل آئے ہیں۔"

"پروا نہ کرو، بچھا لینے دو انہیں جال۔ اب ان کے ہر جال کے تار تار ہونے کا وقت آ چکا ہے۔ انہیں نہیں معلوم، ہم فوج کو قصبے میں لے آنے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ اکبر بھورائی کا خیال یہ ہوگا کہ مارشل لاء تو بس پورے ملک میں لگ سکتا ہے، لیکن ہم اسے جزوی مارشل لاء کہتے ہیں، جو اشد ضرورت کے تحت لگایا جا سکتا ہے اور پھر حالات معمول پر آنے کے بعد اٹھا لیا جاتا ہے۔"

"پھر بھی، کیا اکبر بھورائی اتنا ہی بے وقوف ہے۔"

"بعض لوگ طاقت کے نشے میں بے وقوف ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال ہوگا، دشمن ملک اس کی پشت پر ہے۔ ہم لوگ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، آؤ۔"

وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اترنے لگے۔ عمارت کے درمیان میں ایک کمرے سے ایک آواز ابھرتی سنائی دی۔ وہ اس طرف قدم اٹھانے لگے، پھر خیال آنے پر رک گئے اور انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی:

''محمود، دروازہ کھول آؤ۔''

''جی بہتر۔'' وہ چلا گیا۔ جلد ہی واپس آیا اور سر کے اشارے سے بتایا کہ دروازہ کھول آیا ہوں۔

اب وہ اس کمرے کے دروازے تک پہنچے۔ کمرے میں ابھرنے والی آواز اب انہیں صاف سنائی دینے لگی۔ کوئی کہہ رہا تھا:

''آپ لوگ حیران نہ ہوں، میں نے انتظام کر رکھا ہے، وہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، جوں ہی وہ اندر داخل ہوں گے، انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس ماہ بھی ہماری کارگزاریاں قابلِ تعریف ہیں۔ آئندہ ماہ آپ لوگوں کو کچھ نئی ہدایات اور نئے احکامات ملیں گے، کیونکہ صرف ایک قصبے پر قبضہ کچھ مزے دار بات نہیں۔ ہر شہر پر ہمارا قبضہ ہونا چاہیے۔ عنقریب قدم اٹھایا جانے والا ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے دروازے پر ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ انہوں نے دیکھا، وہ ایک ہال نما کمرے کے دروازے پر موجود تھے۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ ان سب کرسیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک گول سی میز موجود تھی۔ اس میز پر ایک چھوٹا سا سپیکر نصب تھا۔ اسی وقت سپیکر سے ایک آواز ابھری:

''تو آپ لوگ آ ہی پہنچے۔ ہمیں بھی آپ کا انتظار تھا۔ خوش آمدید، لیکن آپ لوگوں نے یہاں آ کر غلطی کی۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے، یہاں اس قصبے کی انتظامیہ کا اجلاس ہو رہا ہے اور اس اجلاس میں عام لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت نہیں، لہٰذا اس جرم کی پاداش میں آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ ڈی ایس پی صاحب، ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیجیے۔''

''پھر ہتھکڑیاں۔'' فاروق نے سرد آہ بھری اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی وقت کمرے میں کچھ اور لوگ داخل ہوئے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا، پولیس کے تقریباً بیس آدمی ان کے پیچھے موجود تھے اور ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

''یہ اس قصبے کے امن کو تباہ کرنے کے مجرم ہیں۔ انہیں گرفتار کر کے لے جایا جائے۔''

''تمہارے کرتا دھرتا ڈی سائٹ، سام لٹ اور غوربان وغیرہ تو ہمیں قید میں رکھ نہیں سکے، ہمارے اپنے ملک کی پولیس بھلا کس طرح گرفتار کر سکے گی۔'' انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

''سن رہے ہیں ڈی ایس پی صاحب۔'' آواز ابھری۔

''ہاں جناب، آپ فکر نہ کریں۔ چلو بھئی لگا دو ہتھکڑیاں۔'' ڈی ایس پی نے کانسٹیبلوں سے کہا۔

''ٹھہریے ڈی ایس پی صاحب۔ پہلے اس اجازت نامے پر نظر ڈال لیجیے اور اگر آپ نے اس اجازت نامے کی حیثیت کو تسلیم نہ کیا تو یہ آپ کی بدقسمتی ہوگی۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا اور اپنا خصوصی اجازت نامہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے اسے پڑھا، ایک لمحے کے لیے بوکھلایا اور پھر منہ بنا کر بولا:

''یہ تو صدرِ مملکت کا اجازت نامہ ہے۔ آپ ملک کے کسی بھی معاملے میں دخل اندازی کر سکتے ہیں، لیکن اس قصبے پر ملک کے صدر کا حکم نہیں چلتا۔''

''تب آپ بدقسمت ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ہتھکڑیاں لگا دو انہیں۔''

کانسٹیبل ان کی طرف بڑھے۔ اسی وقت ایک تیز آواز ابھری:

''ٹھہرو بھئی، ایسی بھی کیا جلدی ہے، ان لوگوں کو ہتھکڑیاں نہیں لگا

جا سکتیں۔"

سب لوگ چونک کر مڑے۔ وہاں بریگیڈیر صاحب کھڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے فوجی جوا[illegible]ا چوکس کھڑے نظر آئے۔

"آپ [illegible]۔ آپ لوگ شہری معاملات میں مداخلت کرنے کیسے چلے آئے۔ آپ کا کام سرحد[illegible] کی حفاظت کرنا ہے۔ جائیے اور سرحدیں دیکھیے۔" ڈی ایس پی نے منہ بنایا۔

"سرحدو[illegible] کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے، ملک میں کس جگہ کوئی ناسور ابھر رہا ہے [illegible]ور کہیں سول انتظامیہ اس ناسور کو پھلنے پھولنے کا موقع تو نہیں دے رہی۔ اگر ایسی کوئی بات نظر آئے، تو ہم شہری معاملات میں مداخلت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس و[illegible]ت بھی صورت حال ایسی ہی ہے، لہٰذا ہم آپ سب کو گرفتار کر رہے ہیں۔"

"آپ ان لوگو[illegible] کو سنبھالیے، میں ذرا اکبر بھورانی کی خبر لیتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے۔"

"آپ لوگ اپنے [illegible]ت میں کانٹے بو رہے ہیں۔" لاؤڈ اسپیکر پر آواز ابھری۔

"وہ کس طرح؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"میرے ایک اشارے پر پڑوسی ملک کی فوج اس قصبے پر حملہ کر دے گی۔ اس صورت میں آپ کا یہ فوجی د[illegible]تہ کیا کر سکے گا۔"

"اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ ہم کمزور نہیں ہیں۔ یہ قصبہ دشمن کے قبضے میں دینے کی بجائے باقاعدہ جنگ لڑنے کے لیے تیار ہیں، آواز دو اپنے ناخداؤں

کو۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"بہت اچھا۔ اب تم لوگوں کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید درمیانی منزل کے کمرے کی طرف بڑھے۔ وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ اصل مجرم کس جگہ موجود ہو سکتا ہے۔ عمارت کو پہلے ہی گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، اندر مجرم بیٹھا تھا۔ میز پر اس کے سامنے ایک مائیک لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ۔ یہ کون ہے ابا جان۔" محمود بولا۔

"اس کا نام تیمور ایاز ہے۔ پچیس سال پہلے اکبر بھورانی کی دھمکی سب سے پہلے اسی شخص کو ملی تھی۔ دھمکی لے کر یہ پولیس کے پاس گیا تھا، مگر پولیس اس دھمکی کو مذاق سمجھی، پھر اسے تین دھمکیاں اور ملیں اور اس کے کارخانے کو آگ لگ گئی، پھر دوسرے سیٹھ الفاریہ کو دھمکی ملی تو اس نے فوراً ہی مطالبہ مان لیا اور فوردین موچی کو رقم ادا کر دی۔ اس طرح اس کا کارخانہ جلنے سے محفوظ رہا۔ سب لوگ تیمور ایاز کو بدقسمت خیال کرتے رہے۔ اکبر بھورانی کا پہلا شکار سمجھتے رہے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ تو خود اکبر بھورانی ہے۔ خود کو ہر شبے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے یہ چال چلی تھی۔"

"حت، تو۔ تو یہ اس ٹیکسی ڈرائیور کا باپ ہے۔"

"ہاں، اس بے چارے کو کیا معلوم کہ میرا باپ کون ہے، کیا ہے۔"

"اُف اللہ۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"تم تباہی کے دروازے پر دستک دے چکے ہو جمشید، ایک بڑے ملک کو حملے کے لیے للکار چکے ہو۔"

"دیکھا جائے گا۔ اپنے ملک کا ایک پورا قصبہ بھی تو ان کے قبضے میں نہیں

دیا جا سکتا۔ یہ تو پورا ملک دشمن کے قبضے میں دے دینے کے برابر ہوگا۔"

اور ان کے ساتھ آنے والے چند فوجیوں میں سے دو آگے بڑھے اور انہوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ نیچے اس کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا، لیکن وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔ خوش و خرم اور بے فکر تھے۔

"ابا جان، یہ اتنے بے فکر کیوں ہیں؟"

"ان کا خیال ہے، ان کا ساتھی ملک ابھی حملہ کر دے گا اور انہیں چھڑا لے گا۔ ہم جنگ بند کرنے کے سلسلے میں اس کی ہر شرط مان لیں گے، لیکن یہ بے چارے خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، کوئی گئی گزری قوم نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ڈی ایس پی کی طرف مڑے۔

"مسٹر ڈی ایس پی، آپ کیا کہتے ہیں۔ خاموشی سے اپنی ڈیوٹی پر جانا پسند کریں گے یا اکبر بھورانی کا ساتھ دیں گے۔"

"مم، میں۔ میں۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"جائیے اور اپنی ڈیوٹی سنبھالیے۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اب اکبر بھورانی کا دور ختم ہو چکا ہے اس قصبے میں اب کبھی اس کا حکم نہیں چل سکے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

سب لوگوں کو گرفتار کر کے ملٹری کی حوالات کی طرف روانہ کر دیا گیا، پھر وہ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔

"ابا جان، ابھی ہمیں دارالحکومت جا کر اس غدار انسپکٹر کو بھی قانون کے حوالے کرنا ہے۔" فرزانہ نے گویا یاد دلایا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔ فوجیوں تک ان غلط فلموں کو پہنچنے سے روکنا ہے، منشیات کا طوفان روکنا ہے اور انتظامی ڈھانچے کو پاک کرنا

ہے۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

اسی شام وہ لوگ واپس دارالحکومت جا رہے تھے۔ ایر پورٹ پر انہیں اطلاع ملی کہ پڑوسی دشمن ملک نے ملک کی سرحدوں پر بے تحاشا فوج جمع کر دی ہے، گویا وہ کسی وقت بھی اعلانِ جنگ کر سکتا تھا یا اعلان کیے بغیر ہی جنگ چھیڑ سکتا تھا۔

"اب کیا ہوگا ابا جان؟"

"زندہ قوموں کو اپنے وطن کی حفاظت کرنے کے لیے جنگیں لڑنا ہی پڑتی ہیں۔"

وہ دارالحکومت پہنچے۔ ابھی گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ بیگم جمشید نے انہیں بتایا:

"صدر مملکت بہت پریشان ہیں۔ وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔"

"آؤ بھئی، صدر صاحب سے بھی مل آئیں۔" وہ مسکرائے۔

ایوانِ صدر پہنچے تو انہیں بے تابی کے عالم میں ٹہلتے پایا۔ ان کے مشیر بھی ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر رک گئے۔ صدر صاحب کانپتی آواز میں بولے:

"جمشید، یہ کیا کر لیا۔ پوری قوم پر جنگ مسلط کر دی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں سر، میں نے مسلط کر دی؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں جمشید، تم نے، صرف تم نے۔"

"وہ کیسے؟" وہ پرسکون آواز میں بولے۔

"دشمن کا کہنا یہی ہے۔ جانتے ہو، اس کا مطالبہ کیا ہے؟"

"بھلا کس طرح جان سکتا ہوں۔"

"ان کا مطالبہ یہ ہے کہ تمہیں اور تمہارے بچوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اکبر بھورانی نامی آدمی کو رہا کر دیا جائے اور قصبہ جالوم سے فوج بالکل ہٹالی جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس قصبے پر اپنا قبضہ چاہتے ہیں۔"

"پہلے آپ مجھ سے تمام حالات سن لیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اس مہم میں پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی ہمارے ساتھ تھے، بلکہ پروفیسر بے چارے تو زخمی بھی ہو گئے۔"

"اوہو اچھا۔" ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"جی ہاں، میں شروع سے عرض کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے پوری تفصیل سنادی۔ صدر صاحب کی حیرت اور پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ تمام باتیں دہرانے کے بعد انہوں نے کہا۔

"ایک طرح سے قصبہ جالوم پر تو وہ پہلے ہی بہت عرصے سے قابض چلے آ رہے تھے اور اس ناجائز اور خفیہ قبضے کی وجہ سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے رہے تھے، لہٰذا اب صرف یہ فرق پڑ گیا ہے کہ وہ اب ہمیں بھی قیدی بنانا چاہتے ہیں تاکہ اپنے ناپاک منصوبوں پر آسانی سے عمل کر سکیں۔ اب اگر آپ یہ سب کچھ پسند کرتے ہیں تو ہم اسی وقت دشمن کی قید میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ باقی رہا قصبہ جالوم کا معاملہ، وہ پہلے ہی ان کے قبضے میں تھا۔ اب باقاعدہ ان کے قبضے میں چلا جائے گا۔ میں نے تو ان کا قبضہ ختم کیا ہے۔ جہاں تک جنگ مسلط کرنے کا الزام ہے، وہ تو پوری دنیا پر مسلط ہے۔ کسی وقت بھی تیسری عالم گیر جنگ شروع ہو سکتی ہے اور اس جنگ میں ہمیں ہر حال میں شامل ہونا پڑے گا اور وہ جب بھی شروع ہوگی، قصبہ جالوم جیسے کسی چھوٹے سے معاملے سے ہی شروع ہوگی۔ آپ اس جنگ کو روک لیں۔ قصبہ ان کے حوالے کر دیں۔ ہم بھی ان کی قید میں چلے جائیں گے، پھر کیا ہوگا، وہ ایک قصبے کے بعد دوسرے قصبے پر دانت جمادیں گے۔ ہم سرنگ سے نکل آنے کے اگر خاموشی سے یہاں آ جاتے اور بھورانی کو کچھ نہ کہتے تو حالات اور بھی نازک صورت اختیار کر لیتے۔ دشمن ملک وہی نازک حالات پیدا کرنے کے تو خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے تو اس کے خواب کو چکنا چور کیا ہے۔ اس پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ اگر آپ کو میرا یہ کام پسند نہیں آیا تو آپ اسی وقت کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں، ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ ان کی جذباتی آواز نے ایک جادو سا طاری کر دیا تھا۔ صدر صاحب بھی سکتے کی حالت میں بیٹھے رہ گئے۔ آخر انہوں نے کہا:

"مجھے ان تمام حالات کا علم نہیں تھا جمشید، تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ان حالات میں ہمیں جنگ سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ دشمن اگر جنگ چھیڑتا ہے تو شوق سے چھیڑے۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ قوم اسے منہ توڑ جواب دے گی ان شاء اللہ۔ مجھے تم پر فخر ہے جمشید۔ تمہارے بچوں اور دوستوں پر بھی فخر ہے۔ یہ قوم تمہارے احسانات کبھی نہیں بھلا سکتی۔"

"شکریہ۔" انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

اسی شام ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔ ملک کا بچہ بچہ اٹھ کھڑا ہوا اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ فضا قومی ترانوں سے تھرانے لگی۔ سرحدوں پر ایسا جوش اور ولولہ دیکھنے میں آیا جس کی مثال نہیں مل سکتی، لیکن فوجوں کو حکم تھا کہ پہل ہرگز نہ کریں۔ فوجیں دشمن ملک کے حملے کا بے چینی سے انتظار کرتی رہیں۔ ایک شام انسپکٹر جمشید گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اتفاق سے اس روز انہوں نے پروفیسر داؤد کو غسلِ صحت منانے کی خوشی میں دعوت بھی دے رکھی تھی۔ خان رحمان اور ان کے بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب کا علا

ستہ کے بغیر کس طرح آ سکتے تھے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کے چہرے پر دل کش مسکراہٹ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''خیر تو ہے جمشید، یہ مسکراہٹ کس خوشی میں؟''

''آپ کے غسل صحت کے ساتھ آپ لوگوں کیلیے میں ایک خوشی خبری بھی لایا ہوں۔''

''خدا کا شکر ہے اور بے پناہ خوشی کی بات ہے کہ آپ خوشی کی خبر لے کر آئے ہیں۔'' فاروق نے جلدی سے کہا۔

''اور خوشی کی خبر یہ ہے کہ دشمن ملک کی تمام فوجیں سرحدوں سے پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں۔''

''کیا مطلب، یہ کیا بات ہوئی۔ وہ تو بہت طمطراق سے آیا تھا اور بڑے مطالبے منوانے کے موڈ میں تھا۔''

''ہاں، لیکن ہمارے ملک نے اس کا ایک مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا اور اب وہ فوجیں پیچھے ہٹا رہا ہے۔''

''گویا اس نے حملے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں، بالکل یہی بات ہے۔''

''اس نے ایسا کیوں کیا آخر۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''دراصل حملہ کرنے کا ارادہ تو اس کا شروع میں ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس گیدڑ بھبکی دے رہا تھا کہ اگر چل گئی تو ٹھیک، ورنہ پیچھے ہٹ جائے گا۔''

''اوہ۔'' ان کے منہ سے نکلا اور پھر ان کے چہروں پر مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔

''اس موقعے پر ایک مصرعہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر سب لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو عرض کروں۔'' فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

''ضرور ضرور۔'' خان رحمان اور پروفیسر داؤد پرجوش انداز میں بولے۔

شائستہ، حامد، سرور اور ناز نے تو تالیاں بجا کر منظوری دی۔

''اوٹ پٹانگ ہی ہوگا، شرطیہ کہے دیتی ہوں۔''

''بلکہ بے وقت کی بانسری ہوگی۔'' محمود بولا۔

''بھئی پہلے سن تو لو۔'' خان رحمان بے تاب ہو کر بولے۔

''اور کیا؟'' پروفیسر داؤد نے جلدی سے کہا۔

''تو سنیے۔ عرض کیا ہے، گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والے اے آسمان نہیں ہم۔'' اس نے کہا۔

اور سب کے سب مسکرا اٹھے۔ محمود اور فرزانہ برے برے منہ بنانے لگے۔

-----------☆☆☆-----------